ماہنامہ

آنکھ مچولی

اس شمارے کے ساتھ ایئر پلانز سے متعلق
۱۲ اسٹیکرز کا تحفہ مفت حاصل کیجئے

فروری ۱۹۹۱ء

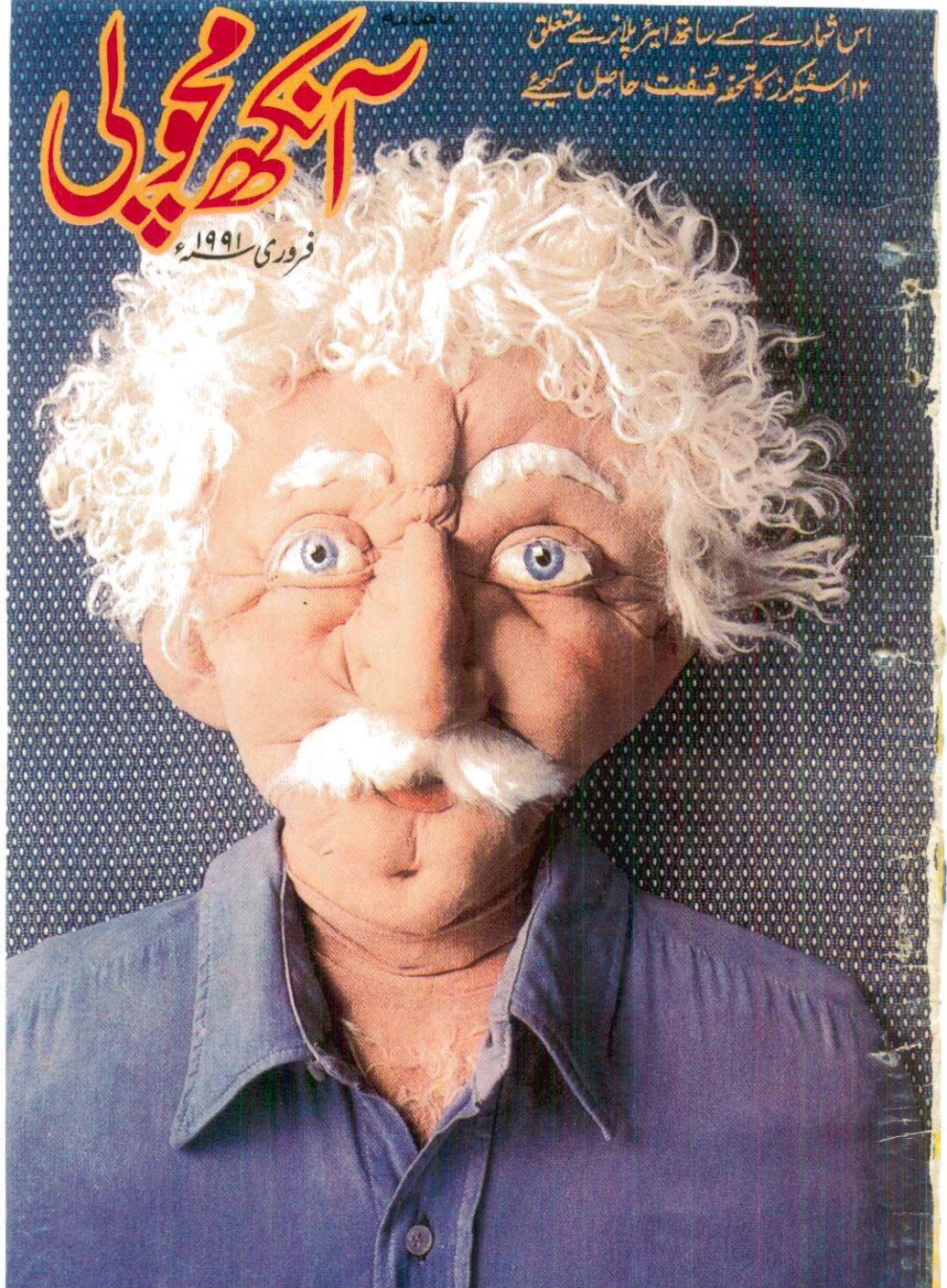

خستہ کرارا - نیا چٹخارہ
فریش ویل
بیسٹ نمکین
Freshwel
Best Namkeen
بیسٹ نمکین کی مکمل ورائٹی کراچی میں
فریش ویل کے تمام سیلز پوائنٹس پر دستیاب ہے
کراچی سے باہر رہنے والے اپنے دوست احباب سے فرمائش کریں

• آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت ◎ رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی ◎ رُکن آل پاکستان چلڈرنز میگزینز سوسائٹی

بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کرنے والا پاکستانی بچوں کا واحد ماہنامہ

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول
تجمل حسین چشتی

مشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی
طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلس ادارت
شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد

اشتہارات
محمد عرفان

سرکولیشن
ریاض احمد

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد ۵ ○ شمارہ ۸ ○ فروری

ناشر: ظفر محمود شیخ • طابع: زاہد علی • مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ، کراچی
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی - گرین گائیڈ اکیڈمی - ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ سائٹ، کراچی

قیمت
۱۰ روپے ۷ درہم ۷ ریال

حُسنِ ترتیب

پہلی بات — ظفر محمود شیخ — ۹

ڈیئر ایڈیٹر — ادارہ — ۱۱

جاڑے کا گیت (نظم) — شاہنواز فاروقی — ۱۵

جب اللہ کا قہر ٹوٹا — محمد بن مالک — ۱۹

میں نے سانپ کا گوشت کھایا — سعدیہ عروسہ سعیدی — ۲۱

بھوکا — منیر احمد راشد — ۲۴

اللہ مدد گار — طاہر مسعود — ۳۱

برف کے شہر کی سیر کو چلیے — سلمیٰ سلیم — ۳۶

ٹنکو میاں بنے اسکاؤٹ — احمد حاطب صدیقی — ۳۸

شعروں میں ترکاریاں — شان الحق حقی — ۴۷

ڈنڈا ڈولی — منتخب لطائف — ۵۱

دام باف مکڑیاں — اخگر انوار اعوان — ۵۶

بے نام خوف — عمران مشتاق — ۶۱

جب ہم بنے مکینک — انور کلیم بلوچ — ۶۷

لیزر — محمد عمران خان — ۶۸

دُنیائے حیرت — محمد صالح ارشاد — ۷۳

حُسنِ ترتیب

جنگل کی بات (نظم) — عنبر چغتائی — ۷۴

انیس کی ڈائری سے — محمد پرویز آرائیں — ۷۷

چھوٹی چھوٹی باتیں ..... — ادارہ — ۸۱

ساتھی کی تلاش — غلام عباس طاہر — ۸۵

مچھلیاں — شین فاروقی — ۸۷

روٹی کا ایک ٹکڑا — بن یامین — ۹۱

مٹی کے [illegible] — رضوانہ عتیق — ۹۷

ہمیں پیاس کیوں لگتی ہے؟ — ذیشان بن صفدر — ۱۰۰

جلد باز — سیّد ذاکر حسین — ۱۰۳

بابا کی نصیحت (نظم) — محمد انوار احمد — ۱۰۷

پرواز سے پہلے — ۱۰۸

نرالا چور — محمود شاہد — ۱۱۱

جھلمل کرتے ستارے — ساجد سعید — ۱۱۹

کمسن قلمکار — قارئین — ۱۲۳

روشن مثال — تعارف — ۱۳۳

امی ابو کا صفحہ — ہما سلیم — ۱۳۸

اب ہر ہفتے ۱۴ پروازیں

کراچی
فیصل آباد
کراچی

پاکستان انٹرنیشنل نے کراچی اور فیصل آباد کے درمیان جمعرات کو ایک براہ راست اضافی پرواز متعارف کی ہے۔ اس پرواز کے اضافے سے اب پی آئی اے مندرجہ بالا رُوٹ پر صبح کی سات اور شام کی سات پروازوں کی سہولت پیش کرتی ہے۔

روزانہ	بدھ	منگل	*روزانہ علاوہ منگل - بدھ		دن		*روزانہ علاوہ منگل - بدھ	منگل	بدھ	روزانہ
343	341	367	337		پرواز نمبر-پی کے		336	366	340	342
737	737	737	737		طیارہ		737	737	737	737
FY	FY	FY	FY		درجہ		FY	FY	FY	FY
1430	2310	2330	2359	آمد	کراچی	روانگی	2000	1730	1630	1030
	2210 2130			روانگی آمد	سکھر	آمد روانگی			1730 1810	
		2205 2130		روانگی آمد	ملتان	آمد روانگی		1855 1930		
1250	2015	2050	2220	روانگی	فیصل آباد	آمد	2140	2010	1925	1210

* یہ نئی پروازوں کو ظاہر کرتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا پی آئی اے کے بکنگ آفس سے رابطہ کریں۔

پی آئی اے PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

PID(ISLAMABAD) IAL-PIA-1-91

کیا آپ کی اسکول شاپ ہے؟

اگر آپ کی کوئی اسکول شاپ ہے تو ہم آپ کے لئے آنکھ مچولی کی خریداری پر خصوصی رعایت اور براہِ راست پرچہ بھجوانے کی سہولت فراہم کر سکتے ہیں۔

یہ خصوصی رعایت کیا ہو گی.....؟

پرچہ کس طرح منگوایا جائے.....؟

خط لکھ کر مفصّل معلومات حاصل کیجئے۔

سرکولیشن منیجر ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ ڈی۔ ۱۱۲ سائٹ کراچی

جائزۂ صحت

(گزشتہ ماہ سے پیوستہ)

جائزۂ صحت کے ۲۵۰ انعام یافتگان میں سے جو گیارہ نام گزشتہ ماہ شاملِ اشاعت نہ ہو سکے تھے انہیں اس ماہ شائع کیا جا رہا ہے۔

نوید احمد، کراچی۔ فضل الرحمٰن راولپنڈی۔ عرشیہ شریف، اسلام آباد سنبیل کمال، ضلع قلات۔ شاہد محمد، ضلع چکوال۔ عثمان عنبر، ضلع دیر۔ علی احمد جان، سکردو، بلتستان۔ جاوید ذیشان، خضدار، بلوچستان۔ فتح شیر خلیل، پشاور۔ عبدالرزاق، کراچی۔ لقمان، کراچی۔

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں

آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰ روپے

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲، ڈی سائٹ کراچی نمبر ۱۶

پہلی بات

لڑنا جھگڑنا آدمی کے غیر مہذب ہونے کی نشانی ہے۔ تہذیب کا مطلب ہے انسان اپنے وحشیانہ جذبات پر قابو پائے اور اپنے اختلافات کو بات چیت کے ذریعے حل کرے۔ قدرت نے اسی لئے انسانوں کی فطرت میں رحم، ہمدردی، محبت اور انسانیت کے جذبات رکھے ہیں اور انہیں عقل کی دولت سے نوازا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کا احترام کریں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کر سکیں۔ یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ ہم سب اس سے واقف ہیں۔ اسی لئے بچپن ہی سے یہ سبق ہمارے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ ہمیں لڑنے بھڑنے سے روکا جاتا ہے اور جو اس ہدایت کو نہیں مانتے انہیں غیر مہذب کہا جاتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن کی اس تربیت کے باوجود لوگ لڑائی جھگڑے سے باز نہیں آتے۔ وہ ایک دوسرے کو تکلیف دیتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے شخص کی جائیداد اور زمین پر قابض ہو جاتا ہے اور ایک انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ فرد سے آگے بڑھ کر گروہوں، جماعتوں اور ملکوں کے مابین بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ کبھی دو جماعتوں کے درمیان فساد ہوتا ہے تو کبھی دو ملکوں کے بیچ لڑائی چھڑ جاتی ہے جس کے نتیجے میں صرف تباہی اور بربادی ہوتی ہے۔ بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں۔ شہر تباہ ہوتے ہیں اور زندگی کے دکھوں اور مصیبتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ لڑائی جھگڑے اور خون خرابے کو غلط سمجھنے اور برا کہنے کے باوجود یہ سب باتیں ختم کیوں نہیں ہوتیں۔ دوسرے لفظوں میں لوگ ظلم کرنے سے باز کیوں نہیں آتے؟ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک وجہ طاقت کا نشہ بھی ہوتا ہے۔ ایک فرد ہو یا ایک گروہ، ایک جماعت ہو یا ایک ملک، جب وہ طاقت کے نشے میں چور ہوتا ہے تو اس کے اندر کی ہوس بڑھ جاتی ہے۔ اس میں دوسروں کو فتح کرنے، انہیں نیچا دکھانے اور ان کا حق مارنے کا جنون پیدا ہو جاتا ہے۔ دنیا میں آج تک جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں اور جنگوں میں انسانوں کا جتنا خون بہا ہے، اس کے پیچھے طاقت کا یہی نشہ کار فرما رہا تھا۔ یہی ہوس ملک گیری پوشیدہ رہی تھی۔ لیکن عجب بات یہ ہے کہ جن لوگوں میں بھی یہ جنون پیدا ہوا۔ پہلے انہوں نے دوسروں کو تباہ کیا اور پھر خود تباہ ہو گئے۔ اس لئے کہ طاقت آخر کار انہی کو ہلاک کر دیتی ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تاریخ ایسے جنونی اور وحشی فاتحین کی عبرت انگیز داستانوں سے بھری پڑی ہے۔

یاد رکھئے! اصلی طاقت وہ نہیں ہے جو بازوؤں یا ہتھیاروں میں چھپی ہوتی ہے۔ اصلی طاقت انسان کے کردار میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور یہ کردار انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جو ان اصولوں پر یقین رکھتے ہیں جو خدا نے ہمیں

بتائے ہیں۔ کیونکہ جب ہم ان اصولوں پر ایمان لاتے ہیں تو خدا کی مدد ہمارے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اور تب ہم کمزور ہو کر بھی کمزور نہیں رہتے، طاقتور ہو جاتے ہیں۔ ہم حق اور انصاف کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور ظالم کے ظلم میں شریک ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ خواہ یہ ظلم کسی نے بھی کیا ہو۔ اللہ دوسروں کا حق مار لینے کو پسند نہیں کرتا اور نہ ان کو پسند کرتا ہے جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور ایسے حالات پیدا کرتے ہیں جن سے بغیر کسی مقصد کے انسانوں کا خون بہے۔ ہمیں ایسے لوگوں کو پہچاننا چاہئے اور ان کی حمایت اور تائید سے ہاتھ اٹھا لینا چاہئے۔

خدا مسلمانوں کے حال پر رحم فرمائے (آمین)

آپکا دوست!

ظفر محمود شیخ

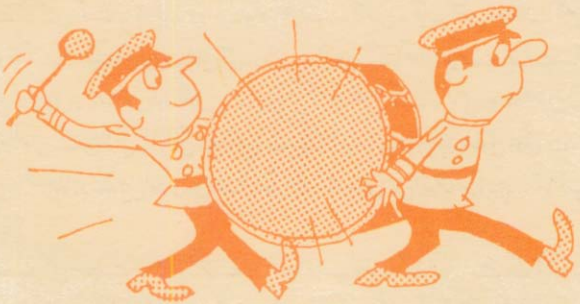

آنکھ مچولی کا

○ ..... نیا سنسنی خیز ناول

○ ..... نئی دلچسپ کہانی

○ ..... نیا مقابلۂ معلوماتِ عامہ

اور لاتعداد دلچسپیوں کا اعلان مارچ ۹۰ء کے شمارے میں ملاحظہ کیجئے۔

ایک خط۔ ایک شکریہ

آج بچوں کے اسکول روانہ ہونے کے بعد حسب معمول میں ناشتہ کرنے بیٹھی تو ڈائننگ ٹیبل پر سامنے ہی دسمبر کا آنکھ مچولی رکھا نظر آیا۔ امی ابو کا صفحہ تو میں عموماً پڑھتی ہی ہوں مگر ذرا ایسے ہی مزید صفحے پلٹے تو اپنی پسندیدہ شخصیت قائداعظم کی تصاویر اور ان پر طاہر مسعود صاحب کا لکھا ہوا مضمون 'محمد علی جناح کا بچپن' نظر آیا۔

محترم قائداعظم کی شخصیت کا وقار بچپن سے ہی میری کمزوری ہے۔ میں سوچتی تھی کہ اگر میں لڑکا ہوتی تو اپنی علمی صلاحیت کو ترقی دے کر اپنے قائد کی طرح ہی لائق اور باوقار ہوتی۔ شاید لاشعوری طور پر میں اس وقار اور قابلیت کو اپنے چاروں بچوں میں دیکھنا چاہتی تھی (لفظ "تھی" اس لئے کہ ابھی اس مضمون کو پڑھنے سے پہلے) اور بڑی مایوس تھی کہ میرے بچے میرے مطلوبہ معیار پر پورے نہیں اترتے وہ کچھ لاپرواہیں اور ہم دونوں کی بتائی ہوئی باتوں اور اصولوں کی مکمل پابندی نہیں کرتے پڑھائی کی بجائے ان کا رجحان اپنے پاپا جان کے ساتھ شاپس پر جانے میں زیادہ ہوتا ہے۔

محترم! نرسری کلاسز کے بعد میں نے اپنے دو بیٹوں غضنفر اور سرفراز کو بڑی تگ و دو کے بعد اسکول میں داخل کروایا۔ وہاں شروع میں تین سال تک ان کا تعلیمی معیار بہت اچھا رہا پھر نہ جانے کیوں ان کی عدم دلچسپی کی بناء پر یہ معیار گرتا گیا اور دونوں اسکول جانے سے کترانے لگے۔ پانچویں کے بعد ان کی چھٹیوں سے تنگ آکر اور پڑھائی سے عدم دلچسپی کی وجہ سے

انہیں اس اسکول سے نکال لیا گیا جہاں انہیں پڑھائی کے ساتھ ڈسپلن اور مینرز سکھانے کے لئے داخل کیا گیا تھا پھر نزدیکی اسکول میں جہاں وہ پیدل ہی جاسکتے ہیں داخل کر دیا گیا اب پڑھائی پر تو بچوں کی توجہ ہے مگر میں بہت مایوس اور بد دل ہو گئی تھی کہ جو بچے اتنے شاندار اور باوقار اسکول میں پانچ برس تک پڑھ کر کچھ مینرز نہ سیکھ سکے وہ آئندہ کیا کریں گے اس قدر لمبی تمہید باندھنے پر معذرت خواہ ہوں مگر میرے محترم! اس مضمون نے شاید میری کایا پلٹ دی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ والدین کو بچوں کے بچپن کی لاپرواہی اور کوتاہیوں پر مایوس اور بد دل نہیں ہونا چاہئے (خصوصاً ماں کو) انہیں ان کی کم عمری کی غلطیوں پر بار بار لعن طعن نہیں کرنی چاہئے کیونکہ کم عمری اور ناسمجھی کے باعث جو وہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں یقیناً کچھ عرصے بعد وہ اس نصیحت یا عمل کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ لیں گے بس راستہ سیدھا ہونا چاہئے خود والدین کے اطوار اور عادات بہتر ہونی چاہئیں تو انشاء اللہ بچے اپنی زندگی والدین سے بھی زیادہ بہتر گزار لیں گے۔

اور یہ بھی کہ میرے قائد محمد علی جناح کو بچپن کی لاپرواہیوں اور کوتاہیوں سے نکالنے میں اور عظیم بنانے میں ان کی ماں کا یقین اور اعتماد بھی شامل تھا۔ (جسے ہم آسان لفظوں میں کہتے ہیں ماں کی دعا) مایوسی اور بے اطمینانی کی اس کیفیت سے باہر نکل آنے پر میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی۔

(نجمہ عثمان۔ کورنگی کراچی)

محمود علی خان، سی پی برار سوسائٹی کراچی، محمد ارشد رضا، محمد نعیم صدیقی اورنگی ٹاؤن کراچی، محمد سعید، مقصود ایم شفیع رحمانی، ماڈل کالونی کراچی، محمد سلیم بھٹی، سکھر۔

اطفال نمبر، بہت ہی اچھا تھا۔ قیمت بھی مناسب تھی۔ اس کے سارے مضامین ہی دلچسپ اور کہانیاں بہت مزیدار تھیں۔ بچوں کی مختلف دلچسپیوں اور کارناموں کے بارے میں ہماری معلومات میں بے حد اضافہ ہوا۔ خاص طور پر اس کے ساتھ جو تحفہ دیا گیا، اس کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ آنکھ مچولی نے اب تک جتنے تحفے دیئے ہیں ان میں یہ سب سے

زیادہ مفید تحفہ ہے۔ لیکن رسالے کے شروع میں اتنے اشتہار کیوں تھے؟

○ ..... "اطفال نمبر" کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ لوگوں کی دعاؤں سے آنکھ مچولی کی فتوحات کا دائرہ آئندہ بھی بڑھتا رہے گا اور بھئی اشتہارات کے بغیر تو ہم آپ کو اتنے اچھے تحائف دے بھی نہیں سکتے۔

محمد ارشد، سکڑ ضلع چار سدہ:۔ اطفال نمبر کے لئے میں نے "آنکھ مچولی" کی جائزہ رپورٹ ۱۹۹۰ء بھیجی تھی اور میں نے اسے کافی محنت سے لکھا تھا۔ آپ نے کیوں شائع نہیں کی میرے پچھلے مضامین اور خطوط بھی آپ نے شائع نہیں کئے۔

○ ..... اچھے دوست! آپ نے واقعی نہایت محنت سے پچھلے سال کے آنکھ مچولی کے شماروں کا جائزہ لیا اس جائزہ رپورٹ سے ہمیں خاصا فائدہ پہنچا لیکن ہمیں اس میں پڑھنے والوں کی کوئی دلچسپی نظر نہیں آئی۔

سہیل احمد عباسی، سکھر:۔ امجد اسلام امجد آپ کے مشاورتی بورڈ میں شامل ہیں لیکن انہوں نے آج تک آنکھ مچولی میں بچوں کے لئے بالکل بھی نہیں لکھا اور لکھا بھی ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ کیا وہ صرف نام ہی کی حد تک آنکھ مچولی سے وابستہ ہیں۔

○ ..... امجد اسلام امجد صاحب کے حوالے سے وقتاً فوقتاً تحریریں رسالے میں چھپتی رہی ہیں۔ لہٰذا آپ کی یہ شکایت تو درست نہیں کہ انہوں نے برائے نام لکھا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی دوسری مصروفیتیں اتنی ہیں کہ بچوں کے لئے بہت زیادہ لکھنے کا موقع نہیں مل پاتا۔

محمد مصباح الدین، کھوکھراپار، کراچی:۔ آپ نے دسمبر کے رسالے میں انتہائی اہم مسئلے کی جانب توجہ دلائی۔ کاش! ہمارے ملک کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ دیواروں پر لکھنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ڈیئر ایڈیٹر میں سائرہ عباس نے خاص نمبر کا عنوان انگلش میں بتایا تو آپ نے جواب دیا کہ ہم پہلے ہی انگریزی عنوانوں سے تنگ آگئے ہیں۔ آپ نے جواب دیتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ آپ نے خود اس سلسلے کو انگریزی عنوان دے رکھا ہے۔

○ .... بھئی آپ نے بھی غور نہیں کیا کہ آخر ہم کن انگریزی عنوانوں سے تنگ آئے ہیں؟ ان ہی میں ایک عنوان یہ بھی ہے۔ اور ہم اسے بھی تبدیل کر رہے ہیں آخری بات یہ کہ آپ کا طویل خط بہت دلچسپ اور اچھا لگا۔

غلام عباس طاہر، شور کوٹ :۔ (۱) رنگین صفحات کا معیار گر رہا ہے۔کیوں؟ (۲) ڈیئر ایڈیٹر کا نام وعلیکم السّلام رکھیں۔۔ (۳) قائداعظم کے متعلق بہت سی تحریریں بھیجیں ایک بھی شامل نہ تھی۔ میرا قصور بتادیں (۴) کیا آپ کو کشمیری ماؤں، بہنوں کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی ہیں؟

○ .... (۱) معیار گر رہا ہے؟ ثابت کیجئے (۲) تجویز پسند آئی شکریہ (۳) یقیناً آپ بے قصور ہیں قصور آپ کی تحریر کا ہے (۴) کشمیر پر کہانیاں چھپتی رہی ہیں اب بھی کوئی تحریر ملے گی تو ضرور چھپے گی۔

شفیق احمد، امجد حسین، ڈیرہ بیساں :۔ بھائی جان! ہم نے پچاس پچاس پیسے جمع کر کے ایک لفافہ خریدا ہے اس لئے ہمارا نام ضرور شائع کرنا ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے براہ کرم گاؤں کا نام ڈیرہ بیساں شائع کرنا شکریہ۔

○ .... لیجئے بھئی آپ کی فرمائش پوری کردی۔ اب آپ یقیناً خوش ہوں گے۔

محمد رفیق، کراچی :۔ آپ نے یہ چمکتے ہوئے رنگین صفحے کیوں ختم کر دیئے؟ رسالے کی انفرادیت میں ان صفحات کا بہت بڑا کردار تھا اور یہ آپ کو ہر سال ایک نیا نمبر کہاں سے مل جاتا ہے ہمیں آپ کے ذہن پر حیرت ہے واقعی!

○ .... رنگین صفحوں کی تعداد تو بڑھ گئی ہے۔ رہا سوال نمبروں کا تو بھئی ذہین پڑھنے والوں کے لئے رسالہ نکالنے میں ذہانت کا استعمال تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

محمد سلیم بھٹی، سکھر :۔ آپ نے اطفال نمبر میں سچن ٹینڈ ویکر بھارتی کھلاڑی کا تعلق پاکستان سے بتایا ہے اس غلطی کی تصحیح کر دیجئے۔

○ .... غلطی پر توجہ دلانے کا شکریہ آپ کی نشاندہی پر تصحیح ہو گئی ادارہ معذرت خواہ ہے۔

جاڑے کا گیت

شاھنواز فاروقی

جیسے کوئی رٹے پہاڑا
آیا دانت بجاتا جاڑا

چڑیا جی نے مفلر مانگا
بندر ڈھونڈ رہا ہے ٹائی
بیٹھی سمٹی ہوئی گلہری
بڑی زور کی ٹھنڈک آئی

اچھے اچھے کانپ رہے ہیں
سردی نے پھر جھنڈا گاڑا
آیا دانت بجاتا جاڑا

بیٹھے ہیں سب آگ جلا کر
نہیں نکلتے ہیں اب گھر سے
باہر جانے سے کترائیں
لوگ سبھی سردی کے ڈر سے

بند کھڑکیاں دروازے سب
گھر لگتا بھینسوں کا باڑا
آیا دانت بجاتا جاڑا

تلی پکوڑی اور چائے کے
آئے ہیں دن وہی پرانے
کوٹ سوٹ کا موسم لوٹا
نکلے کن ٹوپے دستانے

کم پیسے والے لوگوں نے
لنڈے کے بازار کو تاڑا
آیا دانت بجاتا جاڑا

(ہندی نظم سے ماخوذ)

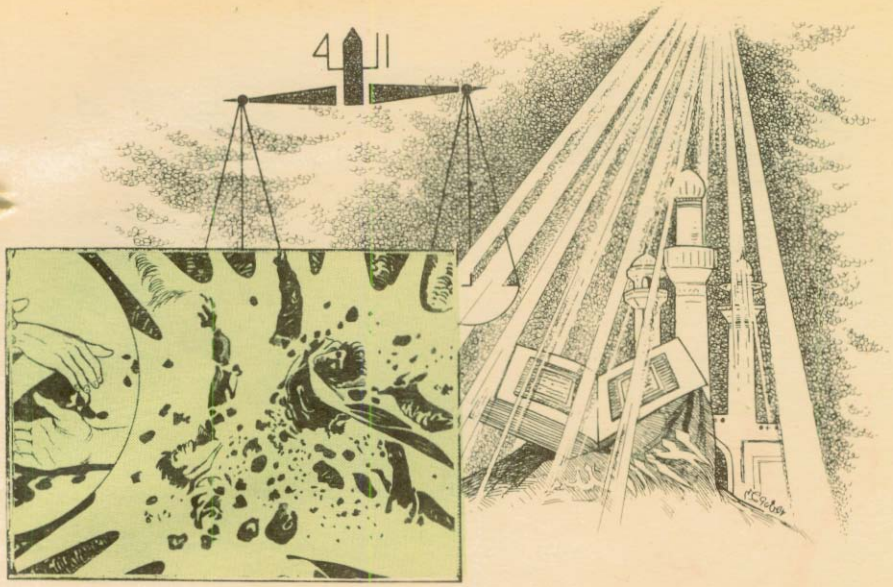

اللہ کا قہر ٹوٹا

محمد بن مالک محمدی

قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر قوم عاد و ثمود کا ذکر ملتا ہے۔ اس مضمون میں ہم آپ کو قوم ثمود کے تاریخی پس منظر کے بارے میں بتائیں گے۔

قوم ثمود عرب کی قدیم ترین قوم ہے یہ قوم عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہے۔ قوم ثمود شمالی مغربی عرب کے اس علاقے میں رہتی تھی جو آج بھی الحجر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان ایک اسٹیشن پڑتا ہے، جسے مدائن صالح کہتے ہیں، یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانے میں حجر و کہلاتا تھا۔ آج بھی یہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں، جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر بنایا تھا۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار

قدیمہ کے درمیان سے گذرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گزرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھائے اور فرمایا کہ: "یہ اس قوم کا علاقہ ہے، جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ۔ یہ سیر گاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔"

ثمود لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے۔ مدائن صالح میں اب تک ان کی یہ عمارتیں جوں کی توں موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے انجینئرنگ میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی تھی۔

ثمود معاشرے میں شرک اور بت پرستی کا زور تھا اور زمین ظلم سے بھرتی جارہی تھی۔ قوم کے سب سے بُرے لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مست تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت حق کو اگر قبول کیا تو نچلے طبقے کے کمزور لوگوں نے۔ اونچے طبقے کے لوگوں نے اسے ماننے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ ۔ "جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کو ہم نہیں مان سکتے۔"

ثمود والوں نے ایک ایسی نشانی کا حضرت صالحؑ سے مطالبہ کیا تھا جو ان کے نبی ہونے کی کھلی دلیل ہو اور اسی کے جواب میں حضرت صالحؑ نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اونٹنی معجزے کے طور پر ظاہر ہوئی تھی۔ اور یہ بھی ایسا ہی معجزہ تھا جو دوسرے انبیاء نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبے پر پیش کیئے تھے۔

قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ:

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَۃِ فِتْنَۃً لَّھُمْ ۔

"ہم اونٹنی کو ان کے لئے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں۔"

وہ فتنہ یہ تھا کہ ایک اونٹنی ان کے سامنے لا کھڑی کی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ ایک دن یہ اکیلی پانی پیئے گی اور دوسرے دن تم سب لوگ اپنے لئے اور اپنے جانوروں کے لئے پانی لے سکو گے۔ اس کی باری کے دن تم میں سے کوئی شخص کسی چشمے یا کنوئیں پر نہ خود پانی لینے کیلئے آئے اور نہ اپنے جانوروں کو پلانے کے لئے لائے۔ یہ چیلنج حضرت صالحؑ کی طرف سے دیا گیا تھا جن کے متعلق وہ خود کہتے تھے کہ یہ کوئی لاؤ لشکر نہیں رکھتا، نہ کوئی بڑا جتھا اس کی پشت پر ہے۔

کافی مدت تک یہ لوگ اونٹنی کے آزادانہ چرنے پھرنے اور اس بات کو کہ ایک دن وہ تنہا پانی پیئے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پئیں، بادل نخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں سے اسے قتل کر دیا۔

"اس شہر میں نو جماعتیں تھی، جو ملک میں فساد پھیلاتیں اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتی تھیں۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ: "خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ، ہم صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی، جس کی انھیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا، ان کو، اور ان کی پوری قوم کو۔"

(سورہ نمل۔ آیت ۴۸ تا ۵۱)

اس سے پہلے کہ وہ اپنے طے شدہ وقت پر حضرت صالحؑ کے ہاں رات کے اندھیرے میں حملہ کرتے اللہ تعالیٰ نے اپنا عذاب بھیج دیا۔ اور نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری قوم تباہ ہو گئی۔

یہ سازش ان لوگوں نے اونٹنی کی کونچیں (دم) کاٹنے کے بعد کی تھی۔ سورہ ہود میں ذکر آتا ہے کہ جب انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا تو حضرت صالحؑ نے انہیں خبردار کیا کہ بس اب تین دن اور مزے کر لو اس کے بعد تم پر عذاب آجائے گا۔ اس پر قوم ثمود نے سوچا کہ عذاب آئے، چاہے نہ آئے، ہم لگے ہاتھوں اونٹنی کے ساتھ اس کا بھی کیوں نہ کام تمام کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے حملہ کرنے کے لئے وہی رات تجویز کی تھی جس رات عذاب آنا تھا، اور قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ حضرت صالحؑ پر پڑتا، خدا کا زبردست ہاتھ ان پر پڑ گیا۔ اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ ہوتا ہے خدا کے نافرمانوں کا انجام۔!

ہڈیوں کے دو ماہر بن کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص سامنے سے لنگڑاتا ہوا آرہا ہے۔ "میرا خیال ہے اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔" ایک نے کہا۔

"میرا خیال ہے اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔" دوسرے نے کہا۔ جب وہ شخص ان کے قریب آیا تو دونوں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا ٹخنا ٹوٹا ہوا ہے یا گھٹنا؟" "بھائیو! میری چپل ٹوٹی ہوئی ہے۔" اس آدمی نے مسکرا کر کہا۔

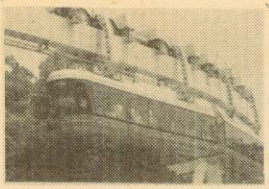

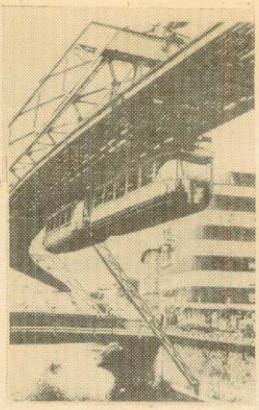

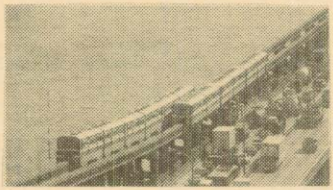

مونوریل کراچی میں

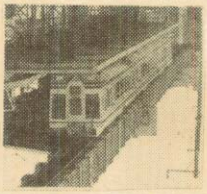

سلیم مغل

یہ ۱۳ دسمبر ۹۰ء کی ایک سہانی صبح تھی جب آنکھ کھلتے ہی اخبار کے پہلے صفحے پر یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ "کراچی میں ٹاور سے سہراب گوٹھ تک بالائی ٹرین چلے گی"۔ اخبار میں نہ صرف یہ خبر شائع ہوئی بلکہ یہ بھی لکھا ہوا نظر آیا کہ "جدید فضائی ٹرین سے ۱۲ گھنٹے میں ۳ لاکھ افراد سفر کریں گے مزید یہ کہ اس نئے ٹرین سسٹم کے لئے عالمی بنک نے قرضے کی منظوری بھی دے دی ہے"۔

اس خبر کا پہلا تاثر بقول فیض صاحب ایسا تھا "جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے"۔

کراچی جو اپنی بے پناہ آبادی اور پُر ہجوم ٹریفک یا ٹریفک کے لاتعداد مسائل کی وجہ سے خاصی شہرت پاتا جا رہا ہے، اس شہر میں ٹریفک کے کسی جدید نظام کی آمد کی خبر سن کر واقعی ایسی خوشی ہوتی ہے جیسے کوئی روتا ہوا بچہ اچانک کھلونا دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔

اخبار کی خبر کا متن ظاہر کر رہا تھا کہ یقیناً یہ ٹرین یا تو مونو ریل سے ملتی جلتی یا پھر مونو ریل کی کوئی جدید ریل ہے۔

جی خوش ہوا خبر کا متن دیکھ دیکھ کر

ہم نے ارادہ کیا کہ مونوریل پر کچھ نہ کچھ پڑھا جائے اور پڑھ کر اپنے ساتھیوں کو اس جدید نظام کے متعلق بتایا جائے جو عنقریب کراچی میں شروع ہونے والا تھا۔

ہم نے وقت نکال کر کچھ نہ کچھ پڑھ بھی ڈالا مگر عین اس وقت ہمارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی جب ہمیں کراچی ٹرانسپورٹ سے متعلق ماہرین نے یہ بتایا کہ "کراچی میں فی الحال ٹرین کا تو کوئی سسٹم شروع نہیں ہو رہا۔"

پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مؤقر روزنامے میں خبر کی اشاعت کے صرف ایک ہفتے بعد، یہ تردید سن کر دکھ بھی ہوا غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ ہمارا غصہ تو تھوڑی دیر میں رفع ہو گیا۔ البتہ اپنے آپ سے ندامت سی ہونے لگی کہ ہم نے اس خبر پر یقین ہی کیوں کیا؟ ہمیں پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا کہ یہ منصوبہ سرکاری ہے اور سرکاری منصوبہ تو کسی وقت بھی ٹائیں ٹائیں فش ہو سکتا ہے.....

آپ ہماری باتوں سے مکمل طور پر مایوس نہ ہوں مایوسی تو یوں بھی کفر ہے۔ کراچی میں ٹرین کا نہ سہی، ابتدائی سطح پر ایک اور سسٹم شروع کیا جا رہا ہے بلکہ کاغذات کی حد تک تو شروع ہو بھی چکا ہے۔ اگر یہ سسٹم آئندہ چند برسوں تک نظر بد (یہاں نظر سے مراد افراد بھی ہو سکتے ہیں) کا شکار نہ ہو گیا تو یہ نظام بھی کچھ کم فائدہ مند نہیں۔

انشاءاللہ ہم آپ کو مارچ ۹۱ء کے شمارے میں اس جدید نظام کے متعلق ضرور بتائیں گے جو کراچی میں شروع ہونے والا ہے فی الحال تو ہم مونوریل کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کرتے ہیں، ممکن ہے اس صدی میں نہ سہی آئندہ صدی میں سہی یہ مونوریل ہماری سڑکوں سے کچھ اوپر اوپر دوڑتی بھاگتی نظر آئے۔

مونوریل اگر آپ کو کبھی کراچی کی تفریح گاہ فن لینڈ کلفٹن جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ نے ایک ایسی ٹرین ضرور دیکھی ہو گی جو زمین سے پندرہ بیس فٹ کی اونچائی پر مختلف ستونوں کی مدد سے بنائی ہوئی پٹڑی پر چلتی ہوئی نہایت تیزی کے ساتھ اوپر نیچے اور دائیں بائیں دوڑتی رہتی ہے۔ بچوں کی یہ کھلونا ٹرین مونوریل تو نہیں ہے مگر یہ بڑی حد تک مونوریل سے مشابہ ہے۔ اپنی جن خصوصیات کے باعث یہ مونوریل سے ملتی

جُلتی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

○ ..... مونوریل نہ تو زمین پر چلتی ہے اور نہ ہی زیر زمین بلکہ زمین سے بیس پچیّس فٹ بلندی پر سفر کرتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ فاصلے فاصلے پر بڑے بڑے ستون بنا کر ان پر ریل کی پٹڑی لگا دی جاتی ہے۔ اس طرح سڑک پر چلنے والی ٹریفک کو متاثر کئے بغیر یہ ٹرین اوپر ہی اوپر چلتی رہتی ہے۔

○ ..... مونوریل کی پٹڑی ایک ہی ہوتی ہے۔ عام ٹرینوں کی طرح دو ریل کو ملا کر ایک ٹریک نہیں بنایا جاتا۔ سنگل ریل کے اوپر اور دائیں بائیں پہیے اس طرح لگا دیئے جاتے ہیں کہ وہ ٹرین کے گرد اپنی گرفت مضبوط کر لیتے ہیں۔

○ ..... مونو ریل بجلی سے چلتی ہے، اس میں بہت زیادہ ڈبے نہیں ہوتے، عموماً ایک یا پھر دو اور تین۔

○ ..... مونوریل لمبے فاصلوں کے لئے استعمال نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی شہر کے محدود فاصلوں اور لامحدود مسافروں کے لئے انتہائی موزوں ہے۔

○ ..... جاپان کے شہر ٹوکیو میں ۱۹۶۴ء میں اولمپک کے موقع پر مونوریل بنائی گئی جو آج بھی ایئرپورٹ سے شہر تک چلتی ہے اور روزانہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار مسافروں کو لے کر آتی اور جاتی ہے۔ یہ ریل ۱۳ کلو میٹر کا فاصلہ ۱۵ منٹ میں طے کرتی ہے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ۱۸۲۵ء میں جب پہلی بار اسٹیفنسن نے اسٹیم لوکو موٹو ریل بنائی تو اس ایجاد سے ایک سال قبل مونوریل ایجاد ہو چکی تھی۔ مگر اس کی شکل یہ نہیں تھی جو آج کی دنیا میں نظر آتی ہے۔

۱۸۲۴ء میں برطانیہ کے باشندے ہینلی پومر نے لندن میں لکڑی کا ایک ٹرک بنا کر بالائی ٹریک پہ رکھ دیا۔ ٹریک کے نیچے ایک ایسی ٹوکری سی بنا دی جس میں گھوڑے جتے ہوتے۔ گھوڑے بھاگتے تو ٹرک بھی بالائی سطح پر چلنے لگتا۔ کیسی دلچسپ ہوتی ہوگی اس وقت مونوریل؟

مونوریل سے متعلق آپ کو یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ یہ ٹریک کے اوپر بھی چلتی ہے اور ٹریک کے نیچے لٹک کر بھی چلتی ہے۔ تاہم دونوں صورتوں میں ٹریک پر اس کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔

○ ..... ۱۸۸۸ء میں آئرلینڈ میں بہتر شکل کی مونو ریل بنی جسے اسٹیم انجن نے کھینچا۔ یہ ریل بڑی کامیابی سے ۳۶ سال تک چلتی رہی۔

○ ..... ۱۹۰۱ء میں جرمنی کے اوئی گن لانگنگ نے مونو ریل بنائی اور اپھار تا شہر میں چلائی۔ یہ ریل اس وادی نما شہر میں ۱۳ء۳ کلو میٹر کا فاصلہ آج بھی طے کرتی ہے اور کامیابی سے چل رہی ہے اس کی رفتار ۶۰ کلو میٹر فی گھنٹہ ہے جبکہ حادثے کی شرح صفر ہے۔

○ ..... ۱۹۵۲ء میں مغربی جرمنی ہی میں ایک سوئیڈش سائنس دان نے مونو ریل شروع کی۔ یہ ریل ربڑ کا ٹرک تھا جو کنکریٹ کے ٹریک پر چلا کرتا۔

۱۹۵۹ء میں بچوں کے پسندیدہ مقام ڈزنی لینڈ میں اس کا آغاز ہوا یہ ریل آج بھی وہاں چلتی ہے اور سینکڑوں بچے اس میں بیٹھ کر ڈزنی لینڈ کی تفریح کرتے اور خوش ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو مونو ریل کے متعلق بہت کچھ بتاتے اگر یہ یقین ہوتا کہ کراچی میں جو ریل سسٹم شروع ہونے والا ہے وہ مونو ریل ہی ہے، فی الحال اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

یہ بات ضرور جان رکھئے کہ مونو ریل بڑے شہروں کے شدید ٹریفک کے دباؤ میں بڑی کار آمد اور مفید ریل ہے۔ زیر زمین ریل کے مقابلے میں اس پر خرچ بھی کم اٹھتا ہے اور اس میں حادثات بھی کم ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ زمین پر چلنے والی ٹریفک کو متاثر بھی نہیں کرتی، نہ ہی ٹریفک اسکی راہ میں آکر اس کی رفتار کو کم کرنے کا باعث بنتا ہے۔ جن شہروں میں وقت ہی سب کچھ ہے۔ وہاں یہ ریل وقت بچا کر بہت سوں کا بھلا کرتی ہے۔ اللہ کرے ..... ہم اپنے جیتے جی اپنے شہروں میں مونو ریل یا اس سے بھی بہتر ریل کا نظام دیکھ سکیں۔

کراچی میں جس تیز رفتار سسٹم کی آمد آمد ہے اس کے متعلق ہم آپ کو آئندہ ماہ بتائیں گے۔

دھنس گئیں کیوں گاڑیاں دیوار میں؟

اس تصویر کو دیکھ کر جو تاثر آپ کے ذہن پہ ابھرا ہو گا ممکن ہے وہ یہ ہو کہ یہ تمام کاریں تیز رفتاری کے دوران کسی ناگہانی حادثے کے باعث فضا میں اچھلی ہوں اور آکر اس دیوار میں دھنس گئیں ہوں.....

لیکن نہیں..... آپ کا یہ تاثر نہیں ہو سکتا..... اس لئے کہ آپ اس کمپیوٹر دور کی ذہین ترین نسل میں سے ہیں.....

آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا..... یہ ایک چوک پر بنایا گیا خوبصورت ڈیزائن ہے اور یہ چوک واقع ہے سعودی عرب کے مشہور شہر جدہ میں.....

آرٹسٹ کے تخلیقی ذہن نے دیوار میں نئی کاریں دھنسا کر حسن کے نئے زاویئے تو تلاش کر لئے مگر یہ نہ سوچا کہ محض خوبصورتی کی خاطر نئی اور قیمتی گاڑیوں کا ناس لگ جائے گا۔ یہ آرٹسٹ اگر ہم سے رابطہ کر لیتا تو یقیناً ہم شیر شاہ کراچی سے کچھ پرانی گاڑیاں سستے داموں بہ آسانی خرید کر فراہم کر سکتے تھے..... کیا خیال ہے آپ کا؟

یہ گوہرِ انمول ہیں، کیا مول بتائیں؟

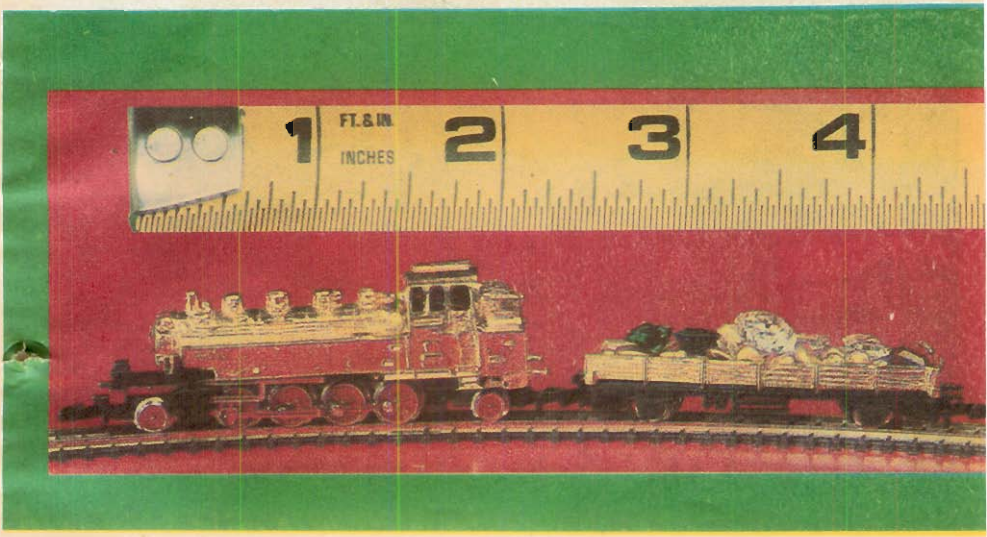

چار انچ کی یہ ٹرین ان ہیروں کے ساتھ اگر فروخت کی جائے تو بلا مبالغہ چار سچ مچ کی ٹرینیں اور پورا ریلوے اسٹیشن خریدا جاسکتا ہے

ہتھیلی پہ رکھے ہوئے بہت سے سفید ہیروں کے درمیان جو ایک سُرخ ہیرا جگمگا رہا ہے، اس کی قیمت چار کروڑ بیس لاکھ روپے ہے اور یہ دُنیا کے پانچ نایاب سرخ ہیروں میں سے ایک ہے۔ یہ ہیرا 'ہیری ونسٹن جیولری کے جواہرات کے ذخائر میں سے ایک ہے۔

قیمت پڑھ کر کچھ یقین آیا؟

(شعبہ تحقیق و تلاش ماہنامہ آنکھ مچولی)

میں نے آسٹریلیا میں سانپ کا گوشت کھایا

سعدیہ
عروسہ
سعیدی

میرے چچا آسٹریلیا میں رہتے ہیں۔ وہاں ان کا قالینوں کا کاروبار ہے۔ ان کے تین بچے ہیں آصف، کاشف اور حُما۔ اس سال جب وہ بقرعید پر پاکستان آئے تو ان کے ساتھ وقت بے حد دلچسپ گزرا حُما ہمارے سارے گھر کی بے حد لاڈلی ہے۔ تین ماہ کے قیام کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو ہمانے ابو امی سے کہا کہ وہ مجھے یعنی عروسہ کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی ہے۔ خاصی بحث اور اصرار کے بعد اجازت ملی۔ ہم تو خوشی سے ناچ اٹھے۔ ہمارے باقی تمام بہن بھائی غصے سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ حکومت آسٹریلیا نے بڑی مشکلوں سے دو ماہ کا ویزا دیا۔ یوں ہم ایئر فرانس سے آسٹریلیا کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاز میں بیٹھنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ اور یہ سفر بھی خاصا طویل تھا۔ یعنی کراچی سے سڈنی چودہ گھنٹے کا طویل اور تھکا دینے والا سفر۔ جہاز نے جب ٹیک آف کیا تو میرا دل (جو پہلے ہی ذرا سا ہے) یک دم ڈوبنے لگا۔ ہم نے گھبرا کر ہما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہما نے تسلی دی کہ ابھی جب جہاز سیدھا ہو کر اڑنے لگے گا تو یہ حالت ٹھیک ہو جائے گی۔ اس نے ہماری توجہ نیچے ایئرپورٹ پر کروائی۔ جہاں رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں سرچ لائٹیں چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی مانند چمک رہی تھیں۔ جب ہم سڈنی ایئرپورٹ پر اترے تو دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ ایئرپورٹ چمک دار دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ چچا ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ راستے بھر وہ مزے مزے کی باتیں کرتے رہے اور ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم گھر پہنچے۔ آنٹی باہر لان ہی میں ہماری منتظر تھیں۔ تازہ دم ہو کر ہم چائے کی میز پر آئے۔ آنٹی نے بڑا اہتمام کیا ہوا تھا۔ کافی۔ کوکونٹ کے بسکٹ، چاکلیٹ کیک، میکرونی اور چکن سینڈوچز۔ تمام چیزیں بے حد مزے دار

تھیں۔ مجھے ہما کا روم میٹ بنایا گیا۔ ہم نے فوراً کمرہ سیٹ کیا۔ میرا بستر بالکل کھڑکی کے نیچے تھا۔ جبکہ ہما کا دیوار کی جانب۔ رات کو میں جلد ہی سوگئی بہت تھکن تھی۔ صبح میری آنکھ بہت سویرے کھل گئی۔ سارا گھر ابھی سو رہا تھا سوائے چچا کے۔ وہ جوگنگ کے لئے جا چکے تھے۔ میں نے دریچے کے پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ اُف اس قدر حسین منظر تھا۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ چچا کا گھر چونکہ سڈنی کے مضافات میں ہے۔ ہر طرف سبزہ اور پھولوں کا راج تھا۔ کمرے کی کھڑکی کے نیچے سے جہاں تک میری نگاہ گئی صرف سبز قالین ہی نظر آیا۔ میں جلدی سے جوتے پہن کر باہر نکل آئی۔ باہر آتے ہی بادِ نسیم کے لطیف سے جھونکے نے میرا استقبال کیا۔ جیسے مجھے سڈنی آنے پر خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ لان میں پھولوں کی بہتات تھی۔ چاروں طرف پھولوں کے خوش رنگ تختے تھے۔ گلاب ہی کی اتنی قسمیں تھیں کہ میں گن بھی نہ سکی۔ گلاب میں اتنے رنگ تھے کہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ نیلا کاسنی اور کالا گلاب میں نے پہلی بار وہاں دیکھا۔ میں وہاں اتنی مگن تھی کہ ہما کے وہاں آنے کا علم بھی نہ ہوسکا۔ ناشتے پر سب ہی موجود تھے۔ چچا نے پروگرام بنایا کہ آج سارا دن گھوما جائے۔ پہلا دن تو بہت ہی مصروف گزرا۔ میں نے بہت انجوائے کیا۔ لنچ ہم نے ہوٹل میں کیا۔ یہاں ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ چچا نے کیبن لیا تھا۔ ہمارے ساتھ والے کیبن میں ایک آسٹریلوی فیملی تھی چچا نے لنچ کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر میں کافی، فرائی فش، آلو کے چپس، سینڈوچز وغیرہ آگئے۔ لیکن ہمیں حیرت یہ ہوئی کہ یہ وہ چیزیں تو نہیں تھیں جن کا آرڈر چچا نے دیا تھا۔ پتہ چلا کہ ہمارے ساتھ والے کیبن کا دیا ہوا آرڈر بیرا صاحب ہماری ٹیبل پر رکھ گئے اور ہمارا آڈر ان کو دے آئے۔ چینی کی ٹرے جس میں بڑے بڑے گوشت کے قتلے ساتھ میں سلاد اور کیچپ تھا۔ گوشت ہماری مرغوب غذا ہے۔ ہم نے فوراً کانٹے سے ایک قتلہ بمع سلاد کیچپ کے منہ میں ڈال لیا۔ آصف جو کسی بات پر ہما سے لڑ رہا تھا ایک دم چیخا۔ اس نے چچا کی توجہ کھانے پر کروائی۔ اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ جو قتلہ میں نے کھالیا ہے اور جو بے حد ذائقہ دار تھا وہ دراصل ایک طرح کے سانپ کا گوشت تھا۔ جو اس ہوٹل کی خاص ڈش ہے اور آسٹریلوی بہت شوق اور رغبت سے کھاتے ہیں۔ تو یقین مانئے مجھے ابکائیاں آنے لگیں۔ اور پھر مجھ سے اور کچھ بھی نہ کھایا گیا۔

سڈنی کو خوب گھومنے اور اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہونے کے بعد ہماری دوسری منزل آسٹریلیا کا مشہور اور خوبصورت شہر ایڈیلیڈ تھا۔ یہاں ہم اٹھائیس نومبر کی صبح گیارہ بجے بائی ایئر پہنچے۔ چچا نے میٹروپول، نامی ہوٹل میں کمرے بک کروائے۔ لنچ کے بعد آنٹی کے ہمراہ میں اور ہما شاپنگ کے لئے نکل گئے۔ جبکہ چچا، آصف اور کاشف ٹی وی پر انگلینڈ اور آسٹریلیا کا کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔ میں

نے وکٹورین شاپنگ سنٹر سے کچھ خریداری کی۔ جس میں جیولری، جوتے، اور اپنے لئے ایک جرسی خریدی۔ ایڈیلیڈ سڈنی کی نسبت خاصا مہنگا شہر ہے۔ چیزیں وافر مقدار میں مگر مہنگی ہیں۔ یہاں اندازہ ہوا کہ اپنا دیس تو بہت سستا ہے۔ آنٹی نے مجھے ایک پرس خرید کر دیا جو آج بھی مجھے اس سفر کی یاد دلاتا ہے۔ ایڈیلیڈ خاصا پر سکون شہر ہے۔ سڑکیں صاف ستھری اور چوڑی ہیں۔ مکانات روشن ہیں۔ ہر گھر کے آگے لان ہے۔ چاہے وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ پودے اور پھولوں سے پیار کرتے ہیں۔ ٹریفک کا نظام بہت اچھا ہے۔ سڑکوں پر انتشار اور ہجوم نہیں ہوتا جیسے ہمارے کراچی میں ہوتا ہے۔ چائے ہم نے ہوٹل میں آکر پی۔ کاشف اور آصف میں شرط لگی تھی کہ یہ میچ کون جیتے گا۔ کاشف کو پورا یقین تھا کہ آسٹریلیا با آسانی جیت جائے گا کیونکہ ابھی اس کے چار کھلاڑی باقی ہیں۔ جبکہ آصف کا اصرار تھا کہ انگلینڈ یہ میچ تقریباً جیت ہی چکا ہے فوسٹر اور بوتھم کے لئے چار کھلاڑی آؤٹ کرنا مشکل نہیں ہے۔ کاشف یہ شرط جیت چکا تھا اور خوب آصف کو چڑا رہا تھا۔

ایڈیلیڈ سے ہم چھ دسمبر کو کینگرو آئرلینڈ جو یہاں سے قریب ہی تھا بائی شپ روانہ ہوئے۔ یہاں ہمارا قیام چچا کے ایک دوست آغا صاحب کے گھر تھا۔ یہ صاحب جانوروں کے ڈاکٹر ہیں۔ چچا نے مجھے بتایا کہ اس آئرلینڈ کو کینگرو آئرلینڈ اس لئے کہا جاتا ہے یہاں پر آسٹریلیا کا مشہور اور عجیب و غریب جانور کینگرو کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ شہر بے حد چھوٹا سا ہے۔ یہاں پر گرمی خاصی زیادہ تھی دھوپ دسمبر جیسے مہینے میں بھی چُبھ رہی تھی۔ دس دن کے قیام کے بعد ہم واپس سڈنی کے لئے روانہ ہوئے۔ اب کرسمس کا تہوار نزدیک تھا یہاں دیکھنے والی رونق تھی شاپنگ سینٹروں میں بے پناہ رش۔ کرسمس کی رات ٹی وی پر پُرلطف پروگرام دکھائے گئے ہر گھر میں کرسمس ٹری سجا ہوا تھا۔ کرسمس ختم ہوئی تو نیو ایئر منانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اب میرے پاس تین ہفتے تھے ان میں میلبورن پرتھ اور کیمبرا ہی دیکھ سکی۔ کیمبرا آسٹریلیا کا صدر مقام بھی ہے۔ جس روز ہم کیمبرا سے لوٹے تو میرے پاس صرف تین دن بچے تھے۔ یہ میں نے گھر پر ہی گزارے آخر وہ دن بھی آگیا جب میں نے پین ایئر لائن سے کراچی روانہ ہونا تھا۔ مجھے یہاں سے جانے کا دکھ تھا۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے سب کو دیکھا وہ لاونج میں شیشے کے پار کھڑے تھے۔ بار بار جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں نے سیٹ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یہاں کے لوگوں اور علاقوں سے پیار ہو گیا تھا۔ آسٹریلوی خاصے مہمان نواز ملنسار اور ہنس مکھ ہوتے ہیں۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد آتے ہیں تو بے اختیار اس سرسبز و شاداب اور پولوں سے مہکتے ملک میں جانے کو دل کرتا ہے۔ جہاں سبز چراگاہیں ہیں جہاں سمندری بگلے اڑتے ہیں۔

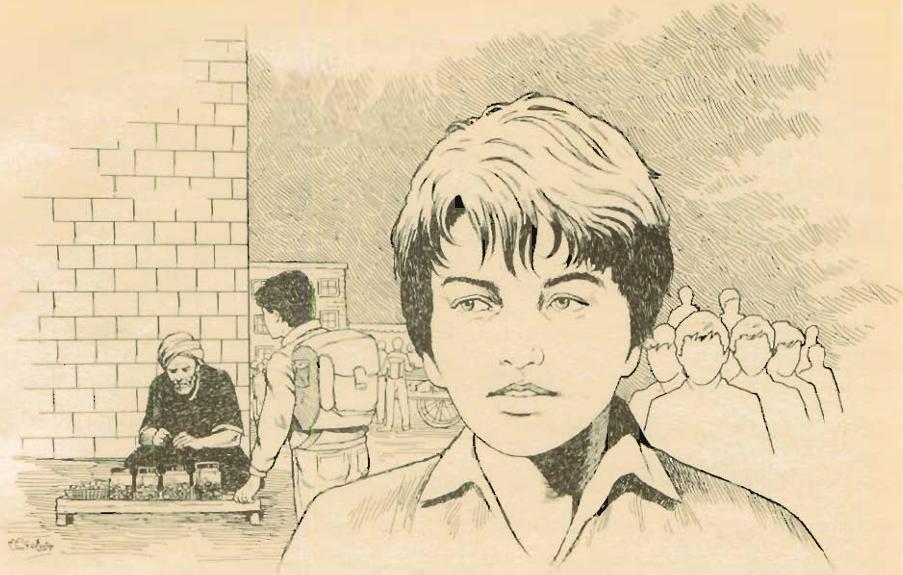

بُھوکا

منیر احمد راشد

بد نصیبی پچھلے دو ماہ سے گلزار صاحب کے ہاں مہمان تھی۔ آج پہلی تاریخ تھی اور ٹھیک دو مہینے پہلے انہیں ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ وجہ معلوم نہ ہو سکی تھی کیونکہ پرائیویٹ اداروں میں بہت سے کام بغیر کسی وجہ کے بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس وقت دوپہر کا ایک بجا تھا اور گلزار صاحب اپنے سب سے چھوٹے بیٹے افضل کو گود میں لئے گھر کے چھوٹے سے آنگن میں ٹہل رہے تھے۔ ایک برس کا افضل بھوک کی وجہ سے بلک بلک کر رو رہا تھا اور کسی طرح بھی چپ ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ گھر کے واحد کمرے کے جس کونے میں چولہا رکھ کر اسے باورچی خانے کا درجہ دیا گیا تھا وہاں افضل کی امی ایک چھوٹی پتیلی میں

صبح کی بچی ہوئی چائے گرم کر رہی تھی۔ پھر وہ چائے کو ایک میلے سے فیڈر میں ڈال کر باہر نکلی، افضل کو گلزار صاحب سے لے کر وہیں قریب پڑی ایک جھلنگا چارپائی پر بیٹھ گئی اور فیڈر افضل کے منہ سے لگا دی۔ ننھے افضل نے بڑی بے تابی سے نپل کو منہ میں دبوچا اور جلدی جلدی چائے پینے لگا۔ بچے کا رونا بند ہوا تو دونوں نے سکھ کا سانس لیا۔ ماں نے بیٹے کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا "دو دن میں آدھا بھی نہیں رہ گیا میرا بچہ۔" پھر گردن اٹھا کر ایسے انداز میں گلزار صاحب کی طرف دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو "خدارا میرے بیٹے کے لئے دوائی کا بندوبست کرو۔" گلزار صاحب یہ سب اشارے سمجھتے تھے۔ بے بسی سے بیوی اور بچے کو دیکھتے اور ہاتھ ملتے رہے۔ پھر کھوکھلے سے لہجے میں تسلی دیتے ہوئے بولے، "دستوں کی بیماری میں ایسا ہی ہوتا ہے...... جسم کا سارا پانی سوکھ جاتا ہے، تم شام کو ڈاکٹر سے دوا لے آنا۔" کہنے کو تو انہوں نے یہ بات کہہ دی لیکن وہ خود سمجھتے تھے کہ بغیر پیسوں کے دوائی کیسے آئے گی؟ بیوی نے ان کے تسلی بھرے الفاظ سن کر بے بس مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔ گویا ان کے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر اس نے پڑھ لی تھی۔ ننھا افضل اب بھی تیزی کے ساتھ فیڈر سے چائے چوسنے میں مصروف تھا۔

شام کو گلزار صاحب نے کہیں سے دس روپے ادھار لیکر بیوی کو دیئے اور وہ محلے کے ڈاکٹر سے ننھے افضل کی دوا لے آئی۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ بچے کو انڈے کی سفیدی کا پانی اور نمکول کا پانی پلائیں باقی سب چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ پرہیز ہی وہ واحد کام تھا جو آج کل گلزار صاحب کے ہاں بہت اچھے طریقے سے انجام دیا جاسکتا تھا۔ جب گھر میں کھانے کے لئے کچھ ہو گا ہی نہیں تو بدپرہیزی بھلا کیسے ہوگی۔ سو سختی سے پرہیز کیا گیا اور تیسرے دن افضل کے دست آنے بند ہوگئے۔ لیکن کمزوری ابھی تک باقی تھی۔

گلزار صاحب کے چھوٹے بھائی اسلم صاحب بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ یہ ان لوگوں کا آبائی گھر تھا۔ دو کمروں اور مشترکہ آنگن پر مشتمل یہ مکان ماں باپ کی وفات کے بعد دونوں بھائیوں کے حصے میں آیا تھا۔ اور اب دونوں ایک ایک کمرے میں اپنے بال بچوں سمیت رہتے تھے۔ اسلم صاحب مٹھائی کی ایک دکان پر کاریگر تھے جہاں سے مناسب آمدنی ہوجاتی تھی۔ گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ اسلم صاحب کی ایک اچھی عادت یہ تھی کہ وہ ہر شام اپنے بچوں کے لئے کوئی نہ کوئی چیز کھانے کے لئے ضرور لاتے تھے، جسے بچے کبھی کمرے میں بیٹھ کر اور کبھی آنگن میں گھومتے پھرتے کھایا کرتے تھے۔ چونکہ گلزار صاحب کی اپنے بھائی سے نہیں بنتی تھی اس لئے بچوں میں بھی چیزوں کا لین دین ذرا کم ہی ہوتا تھا۔ جب اسلم صاحب کے بچے

اپنے ابا کی لائی ہوئی چیز کھاتے ہوئے آنگن میں پھرتے تو گلزار صاحب کے بچے بڑی حسرت سے انہیں دیکھا کرتے تھے۔ گلزار صاحب کے حالات بہتر تھے تو وہ بھی اپنے بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لاتے رہتے تھے۔ مگر آج کل تو دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے تھے پھر بھلا بچوں کی عیاشی کا سامان کہاں سے آتا۔ لہٰذا جب بھی وہ اپنے بچوں کو حسرت بھری نظروں سے اپنے چچازادوں کو گھورتے ہوئے دیکھتے تو انہیں بہت دکھ ہوتا۔ بڑے بچوں کو تو کسی نہ کسی طرح سمجھا لیتے لیکن ننھا افضل ان کی بات نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ کھاتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر بے قراری سے رونے لگتا۔ ماں باپ کبھی اسے چمکار کر، کبھی مار کر سمجھاتے اور کبھی وہاں سے ہٹا کر کمرے میں لے جاتے مگر اس کا رونا بند نہ ہوتا جب تک کہ وہ کچھ کھا نہ لیتا یا تھک کر سو نہ جاتا۔

روز روز کی بیماری اور خوراک کی بے حد کمی نے افضل کے معدے پر بُرا اثر ڈالا تھا۔ وہ مشکل ہی سے کوئی شے ہضم کر پاتا تھا۔ ایک مہینے بعد گلزار صاحب کو نئی ملازمت مل گئی جس سے ان کے گھر کی نہ صرف دال روٹی چلنے لگی بلکہ بچوں کے لئے اکثر ٹافی، مٹھائی اور نمکو بھی آنے لگے مگر افضل کی بیماری کی وجہ سے اسے زبردستی ان چیزوں سے دور رکھا جاتا۔ اس جبری پرہیز کی وجہ سے اس کی فطرت میں ایک عجیب تشنگی سی پروان چڑھنے لگی۔ وہ بہت چھوٹا تھا اس لئے چیزوں کو دیکھ کر سوائے رونے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس تشنگی میں بھی شدت آتی گئی۔ اب وہ دو برس کا تھا۔ گھر بھر میں دوڑتا پھرتا۔ توتلی زبان میں بہت سی باتیں بھی کرتا۔ اس کا پسندیدہ موضوع تھا "کھانا" صبح، دوپہر، شام ..... جب امی کھانا پکانے بیٹھتیں تو افضل سب سے پہلے ان کے قریب جا بیٹھتا اور چھوٹا سا ہاتھ پھیلا کر ایک مناسب وقفے سے دے ..... دے ..... دے کی رٹ شروع کر دیتا۔ امی کو بہت غصہ آتا وہ کبھی تو زبانی اور کبھی چمٹے سے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ضرب لگا کر اسے صبر کی تلقین کرتیں۔ مگر رونے کے درمیان افضل کی دے ..... دے اس وقت تک جاری رہتی جب تک اسے کچھ مل نہ جاتا۔ اس کی خوراک بھی دو برس کے بچوں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ دو دو تین تین روٹیاں کھا جاتا مگر اس کا پیٹ نہ بھرتا۔ اپنا حصہ ختم کرنے کے بعد اس کا ہاتھ دوسروں کے حصے کی طرف بڑھتا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کے حصے کے بچے ہوئے ٹکڑے اور پیالیوں کی تہہ میں لگی ہوئی چائے تک صاف کر جاتا حتیٰ کہ چائے کی دیگچی میں بچی ہوئی پتی تک ہڑپ کر جاتا۔ گھر میں اگر کبھی پھل آتے تو وہ ان کے چھلکے بھی کھا جاتا تھا۔ پہلے پہل تو سمجھا گیا کہ شاید اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں جو اس کی بھوک ختم نہیں ہونے دیتے۔ لیکن طبّی معائنے سے پتہ چلا کہ ایسی کوئی

بات نہیں ہے۔ ایک بزرگ خاتون نے کہا کہ بچے کو ہوا کا ہو گیا ہے۔ کچھ ٹونے ٹوٹکے کئے گئے مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ آخر یہ کہہ کر صبر کر لیا گیا کہ "بچے کی نیت ہی خراب ہے۔"

افضل تین برس کا ہو چکا تھا۔ اس کی نیت ابھی تک خراب تھی۔ سب سے پہلے کھانا، سب سے زیادہ کھانا اور ہر وقت کھانا اس کی عادت بن چکی تھی۔ اگر بات صرف گھر والوں تک محدود ہوتی تو چلو گوارا تھی لیکن اس کا ندیدہ پن مہمانوں کے سامنے تو اور زیادہ ہو جاتا۔ گھر آنے والے مہمان بچوں کے لئے کوئی چیز لاتے تو افضل اسے چھیننے کی کوشش کرتا۔ کوئی ٹافی کے لئے پیسے دیتا تو بڑے بچے ذرا ہچکچاتے مگر افضل جھٹ سے لے لیتا۔ اگر کوئی مہمان پیسے نہ دیتا تو ہاتھ پھیلا کر اس سے مانگ لیتا۔ مہمانوں کے لئے کھانا لگتا تو وہ بغیر تکلف کے سب سے پہلے دسترخوان پر جا بیٹھتا اور کسی کا انتظار کئے بغیر جلدی جلدی کھانے پر ہاتھ صاف کرنے لگتا۔ ماں باپ کو بہت سُبکی محسوس ہوتی۔ وہ مہمانوں کے سامنے تو ہنس کر اور یہ کہہ کر کہ "بہت نیت خراب ہو گیا ہے" بات کو ٹال دیتے۔ مگر بعد میں افضل کی خوب پٹائی ہوتی۔ اِس کا بھی اُس پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ کھانے کو سامنے دیکھتے ہی وہ مار پٹائی کا سارا خوف بھول جاتا اور کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔

اب افضل پانچ سال کا ہو گیا تھا۔ ماں باپ کی بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اب وہ کم از کم مہمانوں کے سامنے ندیدے پن کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ لیکن گھر میں اس کی وہی حالت تھی۔ البتہ اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ وہ دوسروں کے سامنے جھوٹی چیزیں اور پھلوں کے چھلکے نہیں کھاتا تھا۔ تنہائی میں ضرور ان سب سے لطف اندوز ہوتا۔

اسکول میں داخل ہونے کے بعد اس کی عادتوں میں مزید بہتری پیدا ہوئی اور اس نے تنہائی میں بھی گندی چیزیں کھانی چھوڑ دیں۔ لیکن اس کا دل ان چیزوں کے کھانے سے نہیں بھرتا تھا جو وہ اپنے جیب خرچ سے خرید پاتا تھا۔

افضل بہت ذہین اور تیز طرار بچہ تھا۔ پڑھائی میں بھی سرفہرست تھا اور کھیلوں میں بھی سب سے آگے۔ اسکول کے تمام استاد اور بچے اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کی ذہانت اور پھرتی کے علاوہ اس کی اچھی عادتیں بھی اس کی عزت کا باعث تھیں۔ وہ سب سے بہت اخلاق سے پیش آتا۔ چھوٹوں سے بہت محبت کرتا۔ پڑھائی میں بھی سب کی مدد کرتا۔ اس لئے اس کا مقام تمام لڑکوں سے نمایاں تھا حالانکہ وہ کلاس کا مانیٹر نہیں تھا لیکن سب لڑکے اس کا کہنا مانتے تھے۔ وہ اپنے اسکول کا بلا مقابلہ صدر تھا۔

اسکول کے چند کھلنڈرے لڑکوں نے مل کر ایک چھاپہ مار گروپ بنا رکھا تھا۔ جس کا کام یہ تھا کہ وہ ہاف ٹائم میں ایسے لوگوں پر چھاپہ مارتا جو کچھ نہ کچھ کھانے میں مصروف ہوتے۔ گروپ کے ارکان کسی سے قلفی چھین لیتے، کسی سے اُبلا اور مصالحہ لگا بھٹا، کسی کی آئس کریم پر ہاتھ صاف کرتے کسی کے ہاتھ سے فروٹ جھپٹ لیتے اور کسی کا پورا لنچ باکس ہی اڑا لیتے۔ اسکول کے اکثر لڑکے ان سے تنگ تھے۔ انہوں نے افضل کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا۔ افضل نے گروپ کے ممبران کو اکٹھا کیا اور انہیں سمجھایا کہ وہ ایسی بُری حرکت نہ کریں۔ مگر گروپ کے لیڈر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ارے افضل بھائی، یہ کوئی بُری حرکت نہیں ہے۔ ہم تو بس ذرا تفریح لینے کے لئے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ ورنہ ہم بھوکے تھوڑا ہی ہیں۔" پھر اس نے جیب میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دکھایا "دیکھو ہمارا جیب خرچ۔ کیا ہم بہت سی چیزیں نہیں خرید سکتے۔" پھر مزا لینے کے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا، "لیکن چھین کے کھانے میں جو مزا ہے وہ خرید کر کھانے میں کہاں؟" اور ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اگلے دن ہاف ٹائم میں جب افضل اپنے روپے سے ایک قلفی خرید کر کھا رہا تھا تو چھاپہ مار گروپ کا لیڈر ہاتھ میں ایک آئس کریم تھامے اس کے پاس آیا اور آئس کریم اسے پیش کی۔ پہلے تو افضل نے انکار کیا۔ مگر اس کے بے حد اصرار پر بالآخر اس نے وہ آئس کریم کھا ہی لی۔ تھوڑی دیر بعد گروپ کا دوسرا ممبر ایک بُھٹا لئے ہوئے وہاں پہنچا، اس میں سے بھی افضل کو حصہ دیا گیا۔ پھر ایک اور ساتھی بسکٹ کا پیکٹ لایا اور سب نے مل کر کھایا۔ افضل اس ایک دعوت میں بھی شریک تھا۔ چھاپہ مار گروپ سے افضل کی یہ پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد تو آہستہ آہستہ ان کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی اور افضل کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ وہ پورے اسکول میں چھاپہ مار گروپ کا لیڈر مشہور ہو گیا۔ کیونکہ افضل کے دوستی کے دوران اور بعد میں اس گروپ کی کارروائیاں مسلسل جاری تھیں اور اب تو انہیں افضل کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں تو لڑکوں نے افضل کا لحاظ کیا مگر جب چھاپہ مار گروپ کی کارروائیاں حد سے بڑھنے لگیں تو کچھ لڑکوں نے ان کی شکایت کلاس ٹیچر سے کر دی۔ انہوں نے افضل کو بلا کر سمجھایا تو اس نے ہنستے ہوئے جھٹ وہی جواب دیا، "سر یہ تو ذرا تفریح ہوتی ہے ورنہ ہم لوگ بھوکے تھوڑا ہی ہیں۔" استاد صاحب نے بھی ہنستے ہوئے اسے تنبیہ کی، "ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... تم بس ان لوگوں سے مذاق کیا کرو جو تمہارا مذاق برداشت کر سکیں۔"

بات یہیں ختم ہو گی۔ چند دن احتیاط کے بعد گروپ کی کارروائیاں پھر بڑھنے لگیں۔ دو ایک بار

پھر افضل کی پیشی ہوئی مگر وہ اپنی چرب زبانی سے صاف بچ نکلتا لیکن آج تو بالکل انوکھا واقعہ ہوا تھا۔ ہاف ٹائم میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے چپڑاسی نے آکر کلاس ٹیچر سے کہا "افضل نامی لڑکے کو ہیڈ ماسٹر صاحب نے بلایا ہے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب بہت سخت آدمی تھے۔ وہ کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ افضل نے جب اپنی پیشی کا سنا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ڈرا سہما ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ جہاں پہلے ہی دس پندرہ لڑکے کھڑے تھے۔ یہ سب وہی تھے جو اکثر چھاپہ مار گروپ کی جارحیت کا نشانہ بنتے تھے۔ انہیں دیکھ کر ساری بات افضل کی سمجھ میں آگئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے افضل کی طرف دیکھا اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگے۔ "دیکھو لڑکے تم کچھ پڑھنے لکھنے والے ہو اس لئے ہم تمہیں سخت سزا نہیں دے رہے۔ ورنہ اسکول سے تمہارا نام بھی خارج کیا جاسکتا تھا۔ فی الحال تم پر یہ پابندی ہے کہ تم ایک ہفتہ تک ہاف ٹائم میں اسکول سے باہر نہیں نکل سکتے۔" افضل سر جھکائے یہ سب کچھ سنتا رہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور تمہیں شرم آنی چاہئے تم لڑکوں سے چھین چھین کر چیزیں کھاتے ہو۔ کیا تمہیں گھر سے کھانے کو نہیں ملتا؟ اتنے ہی بھوکے ہو تو مجھ سے روپیہ روز لے لیا کرو۔" انہوں نے بڑے تلخ اور توہین آمیز لہجے میں کہا۔ "یا پھر خود کو بڑا بدمعاش سمجھتے ہو کہ کوئی تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا؟" افضل کو شدت سے اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے آخری وارننگ کے بعد واپس بھیج دیا۔

افضل دفتر سے نکلا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے ہیں۔ اسے اپنے پیچھے لڑکوں کی دبی دبی سی ہنسی بھی سنائی دی۔ شاید کسی نے اسے بھوکا بھی کہا تھا..... دفتر سے اپنے کلاس روم تک وہ نظریں نیچی کئے چلتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اسکول کے ہر لڑکے کی نظر اسی کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ ہر نظر میں تمسخر ہے، تضحیک ہے، جیسے ہر نظر بول رہی ہے اور کہہ رہی ہے "بھوکا"۔

ہاف ٹائم ہو چکا تھا۔ کلاس روم خالی پڑا تھا۔ سب لڑکے اسکول سے باہر جا چکے تھے۔ وہ اپنی سیٹ تک آیا اور بے بسی سے اس پر ڈھے گیا۔ اس کا سارا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کانوں میں لڑکوں کی دبی دبی تمسخر آمیز ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور اس کا احساس ذلت شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ ہاتھوں سے منہ چھپائے، ڈیسک پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ کلاس بالکل سونی پڑی تھی۔ کوئی بھی اس کے آنسو پونچھنے والا نہیں تھا۔ کافی دیر رونے سے اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا اور دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو اس نے سوچا۔ "میں افضل ہوں۔

اسکول کا سب سے ہونہار طالب علم ۔ کل تک سب استاد اور لڑکے میری عزت کرتے تھے۔ لیکن آج ان سب نے میری بے عزتی کر دی۔ ایک ذرا سی بات پر۔ " اسے ہیڈ ماسٹر صاحب پر بھی بہت غصہ آیا جنہوں نے اسے بھوکا کہا تھا اور ایک روپیہ روز دینے کا کہہ کر اس کی توہین کی تھی۔ "ہونہہ۔ کیا میں بھوکا ہوں۔ " اس نے غصے سے سوچا۔ "ایک ذرا تفریح لینے کے لئے اگر کسی سے تھوڑی سی چیز چھین لی تو کیا میں بھوکا بن گیا..... ہونہہ..... میں تو لعنت بھی نہیں بھیجتا ایسے کام پر..... آئندہ تو میں ان کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ " مگر دوسرے ہی لمحے غیر شعوری طور پر اس کی نظر کھڑکی کے شیشے کے پار سڑک کنارے کھڑے ہوئے ٹھیلوں پر جا ٹھہری۔ جہاں اسکول کے بہت سے بچے مزے مزے کی چیزیں کھانے میں مصروف تھے۔ افضل کو محسوس ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کے منہ میں پانی بھرتا جارہا ہے۔

عازمینِ حج متوجّہ ہوں

خوش نصیب ہے وہ شخص جسے اللہ نے حجازِ مُقدّس کے سفر کے لیے منتخب کر لیا۔
اِس سال فریضۂ حج کی ادائیگی پر جانے والے تمام حجّاج کی خدمت میں ضمیر الدّین میموریل آرگنائزیشن ایک ایسا تحفہ پیش کر رہی ہے جو سفرِ حج اور مناسکِ حج کے دوران اُن کے لیے بہترین راہنما ثابت ہو گا۔
جناب شیخ ضمیر الدّین احمد (مرحوم) کی تالیف کردہ کتاب "سفرِ مُبارک" بلا قیمت حاصل کرنے کے لیے شریف ویل سوئیٹس۔ کراچی کے کسی بھی پوائنٹ پہ اپنی حج کی دستاویزات دکھا کر یہ کتاب مُفت حاصل کی جاسکتی ہے۔

خلیج کی جنگ میں جنم لینے والی کہانی

کویت پر جب سے عراق نے قبضہ کیا تھا، گھر میں بحث و مباحثے کا بازار گرم رہنے لگا تھا۔ کھانے کی میز پر، ڈرائنگ روم میں، مہمانوں کی آمد کے موقع پر۔ جب دیکھو یہی مسئلہ چھڑا رہتا تھا۔ پاپا، امی، بھائی جان، آپی، عمران بھائی، سبھی عالمی سیاسیات کے ماہر نظر آتے تھے۔ ان مباحثوں میں مزید گرما گرمی اس وقت آگئی جب امریکہ نے ڈیڈ لائن گزر جانے کے بعد عراق پر حملہ کر دیا۔ عمران بھائی تو بازار سے صدر صدام حسین کی تصویر خرید کر لے آئے اور اسے اپنے کمرے کے دروازے پر آویزاں کر دیا۔ آپی صدام حسین کے خلاف تھیں، انہوں نے اس پر سخت احتجاج کیا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کو کیا اعتراض ہے" عمران بھائی نے کھانے کی میز پر سب کی موجودگی میں پوچھا۔

"صدام حسین نے ایک مسلم ملک پر قبضہ کیا ہے، وہ مسلمانوں کا دوست نہیں ہو سکتا۔" آپی نے کہا۔

"صدام حسین نے امریکہ اور اسرائیل سے ٹکر لی ہے جو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔"

عمران بھائی نے دلیل دی۔

"اگر واقعی ایسا ہوتا تو پھر صدام حسین کو اسرائیل پر حملہ کرنا چاہئے تھا۔ کویت پر قبضہ کرنے کا کیا مقصد ہے۔" آپی نے زور سے کہا۔

"اچھا بھئی۔ تم لوگ پہلے کھانا ختم کرلو۔ پھر بحث میں الجھنا۔" امی جان نے تنگ آکر کہا۔

اس بحث میں یوں تک کبھی شریک ہو جاتے تھے۔ اور دور دور کی کوڑی لاتے تھے۔ سوائے شکیل کے۔ جس کی سمجھ میں یہ بحث کچھ آتی تھی اور کچھ نہیں آتی تھی۔ وہ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ لیکن اپنی عمر سے زیادہ ذہین تھا۔ اور چپ چاپ یہ ساری گفتگو سنتا رہتا تھا۔

شروع شروع میں اسے ان باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی اور جونہی یہ مسئلے چھڑتے وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ لیکن پھر ٹی وی پر خبریں سن سن کر اور یہ دیکھ کر کہ اس کے چاروں طرف یہی بحثیں ہو رہی ہیں۔ اور نئے نئے پوسٹرز نظر آنے لگے ہیں۔ اسے تھوڑا بہت سمجھ میں آنے لگا تھا لیکن اب بھی بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ مثلاً وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ عراق ایک ملک ہے جس نے کویت نام کے ایک دوسرے ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔ لیکن عراق کو یہ قبضہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی طرح یہ بات تو صاف ظاہر تھی کہ امریکہ نے عراق پر حملہ کر کے اس پر بم برسائے ہیں لیکن اسے اب تک یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ آخر اس جھگڑے سے امریکہ کا کیا تعلق ہے۔ امریکی صدر بش کی تصویریں اس نے اخبار اور ٹیلی ویژن پر دیکھی تھیں۔ لیکن پڑھے لکھے لوگ تو لڑائی جھگڑے سے دور رہتے ہیں۔ پھر صدر بش کو حملہ کرنے کی کیا سوجھی۔ شکیل کے ذہن میں اسی قسم کی باتیں منڈلاتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ اب تک کسی سے یہ ساری باتیں پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ اور سوال تو یہ ہے کہ وہ پوچھتا کس سے؟ گھر میں لوگوں کو آپس میں الجھنے سے فرصت ہی کب تھی۔

اگلے دن اسکول میں لنچ کا گھنٹہ بجا تو شکیل کلاس روم سے نکل کر سامنے پارک کی برتھ پر جا بیٹھا۔ آج اس کا جی چھولے کھانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ دوسری برتھ پر بیٹھے ہوئے گھنگریالے بالوں والے لڑکے پر پڑی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہا ہے۔

"کیا وہ رو رہا تھا؟" شکیل نے سوچا۔ ہاں واقعی وہ تو رو رہا تھا۔ لیکن اس طرح کہ کسی دیکھنے والے کو پتا نہ چل سکے۔ شکیل دھیرے سے اٹھا اور دبے قدموں چلتے ہوئے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"تم رو رہے ہو؟" اس نے لڑکے کے شانے کو چھو کر کہا۔

لڑکے نے آنکھیں ملتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم کیوں رو رہے ہو؟" شکیل نے نرمی سے پوچھا۔

"وہ میرے پاپا کو مار ڈالیں گے۔" لڑکے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کون؟" شکیل نے پوچھا "تمہارے پاپا کو کون مارے گا؟"

"امریکی!" لڑکے نے جواب دیا۔
"امریکی تمہارے پاپا کو کیوں ماریں گے۔ تمہارے پاپا نے کیا کیا ہے؟"
"میرے پاپا عراق میں ہیں۔ اور امریکی وہاں بم برسا رہے ہیں۔" لڑکے نے اب اپنی پوری آنکھیں کھول کر شکیل کی طرف دیکھا۔
"ہوں" شکیل نے ایسے ہنکار بھری جیسے اس کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا ہو۔
"تو تمہارے پاپا عراق سے چلے کیوں نہیں آتے؟" اس نے پوچھا۔
"میرے پاپا فوج میں ڈاکٹر ہیں۔ انہیں چھٹی نہیں مل رہی ہے۔" لڑکے نے بے بسی سے کہا۔
"ہاں یہ تو واقعی پریشانی کی بات تھی۔" شکیل نے دل میں سوچا اسے اس لڑکے کی مدد کرنی چاہئے۔ مگر کس طرح...... وہ سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اسے صدر بش کو خط لکھنا چاہئے۔ کچھ اس قسم کا خط۔ "ڈیر مسٹر بش! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ عراق پر بم برسانا بند کر دیجئے۔ کیونکہ میرے ایک دوست کے پاپا فوج میں ڈاکٹر ہیں۔ وہ ایک شریف آدمی ہیں۔ اگر آپ اسی طرح بم برساتے رہے تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ اس طرح میرا دوست یتیم ہو جائے گا۔ اور پارک میں بیٹھ کر روتا رہے گا۔
مجھے امید ہے کہ میرا خط ملتے ہی آپ حکم دے دیں گے۔ اور میرے دوست کے پاپا کی جان بچ جائے گی۔"
شکیل کے ذہن نے تیزی سے خط کا پورا مضمون سوچ لیا۔ اور پھر اس نے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔
"میں تمہارے پاپا کی جان بچا سکتا ہوں۔"
"وہ کیسے؟" گھنگھریالے بالوں والے لڑکے نے تقریباً چیخ کر کہا۔ "مجھے جلدی بتاؤ۔ میں اپنے پاپا سے بہت محبت کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں۔"
"میں صدر بش کو ایک خط لکھوں گا۔" شکیل نے کہا۔ "میں ان کو لکھوں گا کہ وہ عراق پر بم نہ گرائیں۔ اس طرح تمہارے پاپا کی جان بچ جائے گی۔"
"کیا بش تمہاری بات مان لیں گے۔!" لڑکے نے بے یقینی سے کہا۔
"ہاں مجھے یقین ہے، وہ مجھے ایک اچھے آدمی نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ چشمہ لگاتے ہیں۔"

کیا تم یہ خط اردو میں لکھو گے!" لڑکے نے پوچھا۔

"ہاں میری انگریزی ابھی اتنی اچھی نہیں ہے" شکیل نے اعتراف کیا۔

"مگر صدر بش تو اردو نہیں جانتے۔ وہ تمہارا خط کیسے پڑھیں گے؟"

"میں اپنے پاپا سے کہوں گا کہ وہ اسے انگریزی میں لکھ دیں گے۔" شکیل نے مسئلہ حل کر دیا۔

"ہاں ..... ٹھیک ہے۔!" لڑکا خوش ہو گیا۔

شکیل نے اس سے کہا کہ وہ کل ہی خط صدر بش کو بھیج دے گا اور جونہی جواب آیا وہ اسے فوراً بتائے گا۔ شکیل کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ گھنگریالے بالوں والے لڑکے نے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کر لئے۔ اور جاتے جاتے مسکرایا۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

رات جب میز پر روزانہ کی طرح بحث چھڑی تو شکیل بحث سننے کے بجائے چپ چاپ اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا اسے صدر بش کو خط لکھنا تھا کیونکہ اس کا خط لکھنا بہت ضروری تھا لیکن خط لکھنے سے پہلے اس نے اپنے پاپا سے مشورہ کر لینا ضروری سمجھا۔ آج پاپا بھی اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار تفصیل سے پڑھ رہے تھے شاید صبح دفتر جانے کی جلدی میں وہ اخبار ٹھیک سے نہیں پڑھ سکے تھے۔

"پاپا! ایک بات پوچھوں!" "ہاں بیٹا کیوں نہیں۔" پاپا نے کہا۔

"پاپا! میں صدر بش کو ایک خط لکھنا چاہتا ہوں۔" شکیل نے کہا۔

"کیا؟" پاپا نے حیرت سے کہا۔

"ہاں پاپا! صدر بش کو خط لکھنا بہت ضروری ہے۔"

"مگر کیوں؟" پاپا نے کچھ دلچسپی سے پوچھا۔

"پاپا! اس جنگ میں میرے ایک دوست کے پاپا مارے جائیں گے۔ پھر میرا دوست یتیم ہو جائے گا اور وہ پارک میں بیٹھ کر اکیلا روتا رہے گا۔"

"ہوں" پاپا نے اسے غور سے دیکھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر اب بھی شکیل کے بڑے بھائی بہن اسی بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ حق پر کون ہے؟ صدر صدام حسین یا صدر بش!

کویت پر قبضہ جائز ہے ناجائز اسرائیل پر حملہ ٹھیک ہے یا نہیں لیکن شکیل کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں

تھی۔ اسے تو صرف یہ فکر تھی کہ اگر یہ جنگ جاری رہی تو اس کے دوست کے پاپا ہلاک ہو جائیں گے صرف ایک آدمی کو بچانے کے لئے اس جنگ کا رکنا ضروری تھا۔ بہت ضروری۔

"بیٹے! تم صدر بش کو ضرور خط لکھو۔ میں اسے خود پوسٹ کروں گا۔"

پاپا نے شکیل کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے بیٹے! میں تمہیں نہایت افسوس کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ صدر بش تمہاری بات نہیں مانیں گے۔"

"مگر کیوں پاپا؟" شکیل نے معصومیت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ تمہارے دوست کے والد یہودی نہیں ہیں۔ اگر عراق میں یہودی آباد ہوتے تو صدر بش وہاں کبھی بمباری کا حکم نہ دیتے۔" پاپا نے سمجھایا۔

"تو کیا اگر میرے دوست کے پاپا یہودی ہو جائیں تو ان کی جان بچ سکتی ہے؟" شکیل نے سوال کیا۔

"بیٹے! آدمی یہودی مذہب کو اختیار نہیں کر سکتا۔ یہودی وہی ہوتا ہے جو یہودی گھرانے میں پیدا ہوا ہو اور دوسری بات یہ کہ کسی مسلمان کو اپنے مذہب اور عقیدے کے لئے جان بھی دینی پڑے تو دے دینی چاہئے لیکن اسے کوئی دوسرا مذہب قبول نہیں کرنا چاہئے۔"

اب مسئلہ خاصا پیچیدہ ہو چکا تھا۔ اور اس کو حل کرنا شکیل کے بس سے باہر تھا۔ اور اسے اپنے دوست کے پاپا کی جان بچانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ وہ رات گئے تک سوچتا رہا۔

اگلی صبح وہ اسکول میں گھنگھریالے بالوں والے لڑکے کو ڈھونڈتا رہا۔ وہ اسے وہیں پارک میں برتھ پر گزشتہ روز کی طرح بیٹھا ہوا ملا۔ شکیل کو دیکھتے ہی وہ دوڑتا ہوا آیا۔ "کیا تم نے خط لکھ دیا ہے؟" اس نے نزدیک آتے ہی پوچھا۔

"نہیں" شکیل نے جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب تم صدر بش کو خط نہیں لکھنا۔" لڑکے نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" شکیل نے حیرت سے پوچھا "کیا تمہیں اپنے پاپا سے محبت نہیں ہے؟"

"مجھے ان سے بہت پیار ہے" لڑکے نے کہا۔ "لیکن میں اپنے پاپا کے لئے صدر بش سے مدد نہیں مانگوں گا۔ میں ان کی حفاظت کے لئے اللہ میاں سے دعا کروں گا۔ کیونکہ امی کہتی ہیں اللہ میاں صدر بش سے زیادہ طاقتور ہیں۔" گھنگھریالے بالوں والے لڑکے کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے روشنی سی پھیل گئی اور یہ روشنی شکیل کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

برف کے شہر کی سیر کو چلئے

سلمیٰ سلیم

اکثر لوگ موسم کی شدت سے بہت ڈرتے ہیں۔ خاص طور پر شدید گرمی اور شدید سردی سے۔ جہاں ذرا سی زیادہ گرمی یا سردی پڑی لوگ اپنے کام کاج کو چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں، بلکہ لیٹ جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے پڑوسی ملک چین کے صوبے ہیلونگ جیانگ کے دارالخلافے ہربنگ کے لوگ شدید سردی سے گھبرانے کے بجائے اس سے لطف اٹھاتے ہیں اور اس موسم میں اپنی سرگرمیاں کم کرنے کے بجائے بڑھادیتے ہیں۔

ہربنگ میں شدید سردی کا آغاز نومبر سے ہو جاتا ہے اور یہ شدید سردی مارچ تک جاری رہتی ہے۔ اسی دوران یہاں کا اوسط درجۂ حرارت منفی تین رہتا ہے۔ سردی کے ساتھ یہاں برف بھی خوب پڑتی ہے۔ چنانچہ اسکیٹنگ، برفانی ہاکی، سلیڈنگ جیسے کھیل عام ہو جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ اتنی سردی میں تیراکی کا شوق پورا کرتے ہیں۔ ان میں بچے، بوڑھے، جوان، مرد و خواتین سب شامل ہوتے ہیں۔

ذہین اور تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے لوگ اس موسم میں اپنی الگ دنیا آباد کرتے ہیں۔ وہ برف کے گھر بناتے ہیں۔ مشہور کہانیوں کے کرداروں کے مجسمے بناتے ہیں۔ حیوانات، ٹاور غرض جو کچھ ان کے ذہن میں آتا ہے بناتے ہیں۔ ان گھروں، مجسموں، حیوانات اور ٹاوروں میں وہ رنگ برنگے بلب لگادیتے ہیں۔ رات آتی ہے تو یہ تمام چیزیں رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔ اس وقت پورا ہربنگ پراسرار اور جادوئی شہر لگنے لگتا ہے۔ اس شہر کی انہی خوبصورتیوں کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک کے سیاح یہاں آتے ہیں اور زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ سچ ہے جو لوگ زندگی سے محبت کرتے ہیں وہ سخت موسم کو بھی خوشگوار بنالیتے ہیں اور جن لوگوں کو زندگی سے محبت نہیں ہوتی وہ خوشگوار موسم میں بھی رونی صورت بنائے رہتے ہیں آپ اپنا شمار کن لوگوں میں کرتے ہیں۔؟

بچپن سے
سکھا دیتے ہیں
آئس پہ پھسلنا

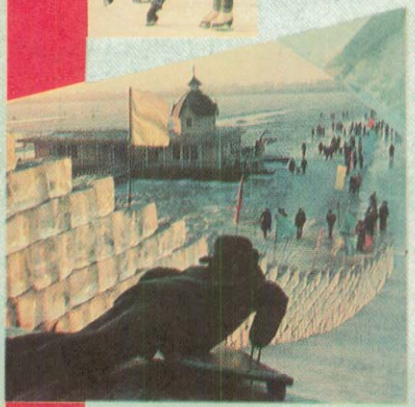

برف پر پھسلنے کا
لطف ہی انوکھا ہے

برف سے
گھر بنا دیا ہم نے

رات آتی ہے تو اس شہر کا کونا کونا
نور سے، رنگ سے بھر جاتا ہے
اور پھر عام سے انسانوں کا چھوٹا سا یہ شہر
پریوں کا، خوابوں کا اک دیس نظر آتا ہے

ٹنکو میاں

اسکاؤٹ بنے

ٹنکو میاں نے اپنا یونیفارم پہنا اور نکل کھڑے ہوئے۔
انہوں نے ایک بڑا اچھا فیصلہ یہ کر لیا تھا کہ اب صرف چھٹی کے دن ہی لوگوں کی خدمت فرمایا کریں گے۔

وہ بیچارے تو اپنی طرف سے لوگوں کی خدمت کرنے ہی نکلتے تھے، لیکن اپنی حماقتوں کی وجہ سے حرکتیں ان سے ایسی سرزد ہو جاتیں کہ پھر لوگ ان کی مرمت کرنے لگتے۔
جو لوگ ٹنکو میاں کی حرکتوں سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے وہ ان کے ہاتھوں اپنی خدمت کروانے سے بچ نکلتے۔ لیکن جو لوگ انہیں جانتے نہیں تھے وہ ان کی بھولی بھالی معصوم صورت دیکھ کر ان

کے جذبۂ خدمت سے متاثر ہو جاتے۔ اور ان کو کوئی نہ کوئی کام سونپ دیتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اچھی خاصی فہرست ایسے لوگوں کی تیار ہو چکی تھی جن کا شمار "ٹنکو میاں کے متاثرین" میں کیا جانے لگا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی زلزلے کے متاثرین ہوتے ہیں، سیلاب کے متاثرین ہوتے ہیں، آندھی اور بارش سے ہونے والی تباہی کے متاثرین ہوتے ہیں یا کسی اور بڑے حادثہ کے متاثرین ہوتے ہیں۔

لیکن ٹنکو میاں نے ذرا بھی سبق نہ لیا۔ سوچ سمجھ کر اور سلیقہ سے کام کرنے کی عادت نہ ڈالی اور اپنے اسی ہڑبونگے انداز میں لوگوں کی خدمت کر ڈالنے اور اسکاؤٹنگ کے جذبہ سے سرشار ہو کر نکل کھڑے ہوتے اور ایک نئی مصیبت کھڑی کر ڈالنے کے بعد سر پر پیر رکھ کر بھاگتے ہوئے گھر واپس آتے۔

.....

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ آسمان صاف تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ نہا دھو کر اپنا استری کیا ہوا یونیفارم پہنے وہ مزے مزے میں گنگناتے ہوئے چلے جا رہے تھے،

"میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے"

"میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے"

اچانک ایک طرف سے ان کو کسی نے زور سے پکارا،

"ارے، چھوٹے سے اک لڑکے!!!"

ٹنکو میاں نے پلٹ کر دیکھا تو "چچا چوکیدار" ان کو چلا چلا کر پکار رہے تھے اور اپنے گھر کی کھڑکی میں سے آدھے باہر نکلے ہوئے تھے۔ چچا کے ہاتھوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آٹا گوندھتے گوندھتے کھڑکی سے باہر لٹک آئے ہیں۔ ٹنکو میاں دوڑ کر ان کے پاس پہنچے،

"ارے بیٹا ٹنکو، یہ تم ہو؟!!! بھئی یونیفارم میں تو تم بالکل فوجی جوان لگ رہے ہو!"

چچا چوکیدار نے ٹنکو میاں کی تعریف کی اور وہ پھول کر کُپّا ہو گئے۔

چچا خود بھی کبھی فوجی رہ چکے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد پہلے تو کسی دفتر میں چوکیداری کرتے تھے، لیکن جب وہاں سے بھی ریٹائر ہو گئے تو محلے کے بزرگوں نے ان کو اپنے محلے کی چوکیداری کے کام پر لگا لیا۔ ہر مہینے ہر گھر سے ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ دوسرے محلوں میں تو ہر دوسرے تیسرے ہفتے چوری چکاری کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آ جاتا۔ لیکن ٹنکو میاں کے محلے میں، جس کی چوکیداری "چچا چوکیدار" کرتے تھے ایک بھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ چچا ڈنڈے اور بندوق ہی سے نہیں ہاتھ پیر سے لڑنے میں بھی بہت تیز تھے، کوئی چور ان کے محلے کی طرف آنے کی ہمت ہی نہیں کرتا تھا۔ رات بھر آواز لگاتے ان کی آواز بھی بہت تیز

ہو گئی تھی۔ اسی لئے تو ٹنکو میاں نے بھی دور سے ان کی آواز سن لی تھی۔ نام تو چوہدری چراغ دین تھا لیکن محلے کے سارے بچے انہیں "چچا چوکیدار" ہی کہتے تھے۔ وہ بے چارے رات بھر چوکیداری کرتے تھے اور صبح کو ناشتہ وغیرہ کر کے سوجاتے۔ ان کے گھر میں ان کے علاوہ کوئی نہیں رہتا تھا۔ محلے کے بچے ان کا کام کر کے خوشی محسوس کرتے تھے اور ٹنکو میاں تو اپنے آپ کو "اسکاؤٹ" سمجھتے تھے، وہ بھلا ان کا کام کیوں نہ کرتے۔ لہٰذا ان کی کھڑکی کے بالکل نیچے پہنچ کر اور آسمان کی طرف یعنی اُن کی طرف سر اٹھا کر ان سے پوچھا کہ:

"چچا کیا آپ کو مجھ سے اپنی مدد کروانی ہے؟"

"ہاں بیٹا! اس وقت بدقسمتی سے تمہارے علاوہ کوئی نظر نہیں آ رہا ہے، تم ہی میری مدد کرو!"

ٹنکو میاں یہ سنتے ہی خوش ہو گئے کہ چلو صبح ہی صبح کوئی مجھ سے اپنی مدد کروانے پر تیار ہو گیا۔ ورنہ اب منت سماجت کرنے پر بھی کوئی مجھ سے اپنی مدد کروانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے اسکاؤٹوں کی طرح "اٹین شن" کھڑے ہو کر پوچھا کہ:

"بتایئے... آپ کو کیا کام ہے؟"

"بیٹا میں نے رات کو گوشت پکا رکھا تھا، جو سارے کا سارا بلی کھا گئی، تم ایسا کرو دوڑ کر دال مرچنٹ کے یہاں سے آدھے درجن انڈے لے آؤ۔"

یہ کہہ کر چچا چوکیدار نے ان کو دس روپے کا نوٹ دیا۔ اور ٹنکو میاں نے فوجیوں والے انداز میں اس طرح دوڑ کر آگے بڑھنا شروع کر دیا جیسے دشمن پر حملہ کرنے جا رہے ہوں۔

....

"دادا دال مرچنٹ" یوں تو ایک دکان کا نام تھا۔ اصل میں اس دکان پر پہلے صرف دالیں فروخت ہوتی تھیں۔ اور ہر قسم کی دال ہر وقت مل جایا کرتی تھی۔ لیکن بعد میں دکاندار صاحب نے اپنی دکان پر ضرورت کی اور بھی سب چیزیں رکھنا شروع کر دیں۔ دکاندار کا نام دلدار درانی تھا۔ داڑھی مونچھوں اور سر کے ہی نہیں بھنوؤں کے بال بھی سفید ہو چکے تھے۔ ان کا اصل نام چھوڑ چھاڑ کر سب لوگ ان کو "دادا دال مرچنٹ" کہنے لگے تھے۔ جو لوگ ان کا اصل نام لیتے تھے وہ بھی انہیں "دادا" کہے بغیر نہیں پکارتے تھے۔ اور "دادا دلدار درانی" کہتے تھے۔

ٹنکو میاں دکان پر پہنچے تو دیکھا کہ "دادا دال مرچنٹ" کی دکان تو کھلی ہے لیکن وہ خود غائب ہیں۔

دکان کے باہر "چچی چوڑی ہارن" کھڑی تھیں۔ گلی کی دوسرے نکڑ پر چچی کی چوڑیوں کی دکان تھی۔ وہاں دن بھر عورتوں اور لڑکیوں کا رش لگا رہتا تھا۔ بعض اوقات چچی اپنی گٹھڑی لے کر گھروں میں بھی جاتی تھیں اور پردہ دار عورتوں اور لڑکیوں کو چوڑی پہنایا کرتی تھیں۔ سارا محلہ انہیں "چچی چوڑی ہارن" کہتا تھا۔

"چچی چوڑی ہارن کیا داداد دال مرچنٹ نے یہ دکان بیچ دی ہے؟"

"نہیں ٹنکو میاں! میں تو یہاں کتھا چھالیہ لینے آئی تھی۔ دادا دلدار ذرا اپنے گھر گئے ہیں، ریزگاری لانے کے لئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ تھوڑی دیر دکان دیکھتی رہیں میں ذرا ریزگاری گن کر لے آؤں تاکہ گاہکوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ وہ آتے وقت اپنے گھر سے ریزگاری لانا بھول گئے تھے۔"

"چچی! دکان کی دیکھ بھال میں کرلوں گا۔ آخر میں اسکاؤٹ ہوں۔ آپ گھر جائیے!"

یہ سن کر چچی نے کہا کہ:

"بیٹا اللہ تمہیں خوش رکھے۔ کتھا چھالیہ تو میں لے چکی ہوں۔ پتہ نہیں دادا دلدار کب واپس آئیں مجھے دکان کھولنی ہے۔ تم ذرا دھیان سے دکان کی رکھوالی کرنا۔ میں جاتی ہوں۔ ورنہ مجھے دیر ہوجائے گی!"

"چچی چوڑی ہارن" تو یہ کہہ کر چلی گئیں اور ٹنکو میاں مستعد ہو کر کاؤنٹر کے پیچھے "دادا دال مرچنٹ" کے اسٹول پر بیٹھ گئے اور دکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ابھی وہ کیک، پیسٹریاں، بسکٹ اور ٹافیوں کو للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھ ہی رہے تھے کہ انہیں "خالو خبردار" آتے دکھائی دیئے۔ انہیں دیکھتے ہی یہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"خالو خبردار" جیسا کہ نام ہی سے اندازہ ہورہا ہے، ہر شخص کو شہر بھر کی ڈراؤنی ڈراؤنی خبریں سناتے رہتے تھے اور کہتے تھے کہ:

"ذرا خبردار رہنا!"

مثلاً کبھی یہ کہتے کہ:

"اگلے محلے میں پرسوں رات کو ڈاکہ پڑ گیا تھا، ذرا خبردار رہنا!"

اور کبھی یہ بتاتے کہ:

"پچھلے محلے میں بجلی کا میٹر دیکھنے کے بہانے ایک گھر میں چور گھس گئے تھے۔ ذرا خبردار رہنا۔"

"شہر میں پیٹ کی بیماری پھیل گئی ہے۔ پانی خراب آرہا ہے، ذرا خبردار رہنا۔"

اس کے علاوہ "خالو خبردار" کسی بچے کو شرارت کرتے دیکھتے تھے تو اس کو ڈانٹتے بھی اس طرح تھے کہ:

خبردار!!! اب ایسی حرکت مت کرنا، خبردار!!!!"

دکان پر انہوں نے ٹنکو میاں کو بیٹھے دیکھا تو حیران ہو کر ادھر ادھر جھانکنا شروع کر دیا۔ ٹنکو میاں سہم کر یہ سوچنے لگے کہ اب شائد وہ:

"خبردار! خبردار"

کہہ کر انہیں ڈانٹنا شروع کر دیں گے۔ لیکن انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ ٹنکو میاں نے پوچھا کہ:

"خالو آپ کوئی خبر سنانے آئے ہیں یا کوئی چیز خریدنے؟"

خالو نے یہ سن کر غصے میں کہا،

"خبردار لڑکے، جو مجھ سے مذاق کیا۔ مجھے تمہاری خالہ نے دو روپے کا خشک دودھ لینے کے لئے بھیجا ہے۔ رات کا رکھا ہوا دودھ پھٹ گیا ہے، چائے تیار رکھی ہے اور مجھے دفتر جانے کی دیر ہو رہی ہے۔"

ٹنکو میاں نے سوچا کہ "خالو خبردار" اگر یہاں کھڑے انتظار کرتے رہے تو نہ جانے کتنی دیر تک مجھے "خبردار خبردار" کہہ کہہ کر ڈانٹتے رہیں۔ چنانچہ انہوں نے دکان میں رکھی ہوئی سفید پاؤڈر کی تھیلی جس پر "قیمت دو روپے" لکھا ہوا تھا، اٹھا کر "خالو خبردار" کو تھمائی اور بولے،

"لائیے دو روپے مجھے دیجئے، جب دادا دال مرچنٹ آئیں گے تو میں ان کو دے دوں گا۔"

خالو نے انہیں دو روپے دیئے اور کہا کہ:

"خبردار انہیں جیب میں مت رکھنا، ورنہ میں دادا دلدار کو تم سے بھی خبردار کروں گا۔"

.....

ٹنکو میاں نے سوچا کہ اس طرح تو مجھ سے خود بخود "دادا دال مرچنٹ" کی مدد ہو رہی ہے۔ وہ مجھ سے بہت خوش ہوں گے اور تعریف کرتے ہوئے کہیں گے،

"تم بہت اچھے اسکاؤٹ ہو!"

وہ اپنی انہی سوچوں میں مگن تھے کہ ان کو دکان پر "ممانی موم بتی" کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ ممانی کے میاں گلی گلی گھوم گھوم کر موم بتیاں بیچا کرتے تھے اور ممانی دن بھر گھر میں موم بتیاں بناتی تھیں۔ جب بجلی چلی جاتی تو محلے کے ہر گھر میں وہ بیچاری خود ایک موم بتی دے آتی تھیں۔ ممانی بہت اچھی خاتون تھیں۔ بچے ان کے میاں کو "ماموں موم بتی" اور ان کو "ممانی موم بتی" کہتے تھے۔ وہ اس نام سے

چڑتی نہیں تھیں۔ خوش ہوتی تھیں۔ کوئی بچوں کو ڈانٹتا کہ :

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

تو وہ منع کرتی تھیں،

"بچوں کو مت ڈانٹو، یہ تو بڑا اچھا نام ہے۔ ویسے بھی میرا نام شمع ہے۔ بچوں نے اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کر لیا ہے۔ میں تو ہر وقت یہی دعا کرتی ہوں کہ

"دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے"

ٹنکو میاں نے انہیں دیکھ کر پوچھا،

"ممانی موم بتی! کیا آپ "دادا دال مرچنٹ" کے لئے موم بتیاں لائی ہیں۔

ممانی یہ سن کر ہنس پڑیں۔ کہنے لگیں،

"نہیں ٹنکو میاں.... میں تو تمہارے ماموں کے لئے حلوہ بنانے جا رہی تھی۔ مگر گھر میں چینی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے تو ایک کلو چینی چاہئے!"

ٹنکو میاں نے دکان میں ادھر ادھر دیکھا۔ ایک ڈبے میں آخر انہیں سفید اور باریک دانوں والی چینی نظر آ ہی گئی۔ انہوں نے جھٹ کاغذ کی ایک تھیلی اٹھائی اور ایک کلو تول کر تھیلی کو اچھی طرح دھاگوں سے باندھ دیا۔ پھر ممانی کے حوالے کرتے ہوئے بولے،

"ایک کلو چینی کے پیسے مجھے دے دیجئے، میں دادا دال مرچنٹ کو دے دوں گا۔" ممانی شاید جلدی میں تھیں۔ انہوں نے پیسے دیئے اور فوراً واپس چلی گئیں۔

.....

ٹنکو میاں سوچ رہے تھے کہ اگر دادا دلدار کچھ دیر اور نہ آئیں، تو بھی، ان کی دکان کی بکری پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آخر میرے اسکاؤٹ ہونے کا انہیں کچھ تو فائدہ ہوا۔

اتنے میں ان کو "بے بی بس بس" نظر آئی۔

بے بی ہر بات میں "بس بس" کہتی تھی۔ اس وجہ سے سارے بچے اس کو "بے بی بس بس" کہہ کر پکارتے تھے۔ اس نے اس وقت گلابی رنگ کی ایک پھولدار فراک پہن رکھی تھی۔ دو چٹیاں اور دونوں میں گلابی ربن بندھے ہوئے تھے۔ ٹنکو میاں نے کاؤنٹر پر سے جھک کر پوچھا،

"بے بی تم کو کیا چاہئے؟"

بے بی نے اپنی توتلی زبان میں کہا،

"بس ایک بڑی والی مکھن کی ٹکیا چاہئے۔ میری امی نے کہا ہے کہ بس پانچ روپے والی ایک بڑی مکھن کی ٹکیا دادا دال مرچنٹ سے لے آؤ بس۔"

ٹنکو میاں نے شوکیس میں سے ایک بڑی سی پیلی ٹکیا اٹھائی اور کاغذ میں لپیٹ کر بے بی کو تھمادی۔ بے بی نے ان کو پانچ روپے دیئے اور دوڑتی ہوئی واپس چلی گئی۔

ٹنکو میاں اسے خوش خوش دوڑتے ہوئے دیکھ کر اور بھی خوش ہوگئے کہ آج تو بہت سارے لوگوں کی مدد کر رہا ہوں۔

اتنے میں "شوشو شیطان" دکان میں گھس آیا۔

"تم کو کیا چاہئے مجھ سے بولو!"

"تم سے کیوں بولوں؟ کیا تم دادا دال مرچنٹ ہو؟ مجھے جو کچھ بھی چاہئے، میں خود لے لوں گا۔"

"شوشو شیطان" نے پھر دکان میں گھستے ہوئے کہا۔

اس کا نام شمشاد تھا، پہلے تو سب اس کو "شمشو" کہتے تھے۔ لیکن چھوٹے بچوں نے جن کو اس کا نام شمشو کہنا نہیں آتا تھا؟ اس کو "شوشو" کہنا شروع کر دیا تو یہ نام لوگوں کو اتنا پسند آیا کہ پھر ہر شخص نے اسے "شوشو" کہنا شروع کر دیا۔ مگر شوشو کوئی اچھا بچہ نہیں تھا۔ ہر وقت شرارتیں اور شیطانیاں کرتا رہتا تھا۔ اسی لئے لوگ اس کو صرف "شوشو" کہنے کے بجائے "شوشو شیطان" کہنے لگے تھے۔

ٹنکو میاں نے اسے زبردستی دکان میں گھستے دیکھا تو اس کے پیٹ میں اپنی کہنیاں رسید کر دیں۔ شوشو نے غصے میں ان کو دھکا دیا تو وہ انڈوں سے بھرے ہوئے ایک کریٹ پر جا گرے۔

"پچاک"

کی ایک زوردار آواز آئی اور بہت سارے انڈے ٹوٹ گئے۔ شوشو شیطان دکان سے باہر نکل کر خوشی سے اچھلنے کودنے اور ناچنے لگا۔

"تم کو انڈوں کے پیسے دینے پڑیں گے۔"

"تم کو انڈوں کے پیسے دینے پڑیں گے۔"

یہ کہتا ہوا شوشو شیطان تو بھاگ لیا۔ مگر ٹنکو میاں کچھ اس طرح انڈوں کے کریٹ میں دھنس گئے تھے کہ اب ان کا نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے اٹھنے کی بہت کوشش کی، مگر بیچارے بری طرح پھنس گئے

تھے۔

....

ٹنکو میاں ابھی نکلنے کی کوششوں میں مصروف ہی تھے کہ دادا دال مرچنٹ ریزگاری کی تھیلی لئے دکان میں داخل ہوئے۔

"ارے ارے! لڑکے تم کیا اپنے آپ کو مرغی سمجھ رہے ہو کہ اس طرح انڈوں پر بیٹھ گئے۔ اٹھو یہاں سے فوراً اٹھو اور انڈے سینے کا کام مرغیوں کے لئے چھوڑ دو!"

ٹنکو میاں نے بیچارگی سے دادا دال مرچنٹ کو دیکھا۔ انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو ان کی پتلون کا پچھلا حصہ انڈوں کی زردی سے لپالپ لتھڑا ہوا تھا۔

دادا دال مرچنٹ غصہ میں آگ بگولہ ہوگئے۔

"چلو فوراً مرغا بن جاؤ۔ تم نے سارے انڈے توڑ ڈالے۔ ان کے پیسے کون دے گا۔ ابھی تمہارے ابا کو لے کر آتا ہوں۔"

ٹنکو میاں فوراً مرغا بن گئے۔ ان کی پتلون کا زردی سے لتھڑا ہوا حصہ اوپر اٹھا ہوا تھا اور سر نیچے تھا۔ وہیں سے انہوں نے مرغے کی "ککڑوں کوں" جیسی آواز میں کہا،

"مجھے شوشو شیطان نے دھکا دے کر گرایا تھا۔ آپ کو سارے پیسے اس سے لینے چاہئیں۔ میں تو اسے دکان میں گھسنے سے منع کر رہا تھا۔"

لیکن تم کیوں گھسے تھے دکان میں؟"

"میں تو آپ کی مدد کر رہا تھا۔ اور آپ کے گاہکوں کو سودا دے رہا تھا تاکہ آپ کا نقصان نہ ہو۔"

ابھی دادا دال مرچنٹ کچھ اور کہنے والے تھے کہ "خالو خبردار" کا سر کاؤنٹر کے اوپر سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔ وہ زور زور سے کہہ رہے تھے،

"خبردار...... دادا دلدار خبردار...... اس لڑکے نے مجھے خشک دودھ کی تھیلی کے بجائے برتن دھونے کے پاؤڈر کی تھیلی تھمادی۔ پوری ایک کیتلی چائے خراب ہوگئی۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا تو میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔"

ابھی خالو خبردار یہ بات کہہ رہے تھے کہ ممانی موم بتی کی چیختی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی،

"اس لڑکے نے مجھے ایک کلو چینی کے بجائے ایک کلو نمک تول دیا۔ میں نے گھر جاتے ہی تھیلی حلوے کی دیگچی میں الٹ دی۔ تمہارے ماموں نے صرف ایک چمچہ لیا تھا کہ سارے گھر میں،

"آخ تھو..... آخ تھو"
کرتے ہوئے کودنے لگے۔"
ان کے پیچھے پیچھے "بے بی بس بس" کی امی چنگھاڑتی ہوئی آگئیں،
"اس لڑکے نے میری بچی کو مکھن کی ٹکیا کے بجائے صابن کی ٹکیا تھمادی۔ وہ اپنے توس پر ٹکیہ کاٹ کاٹ کر لگانے لگی۔ لیکن جب وہ پگھلائیں تو اس نے مجھے دکھایا۔ میں نے ایک ٹکڑا چکھ کر دیکھا تو وہ صابن تھا میری تو طبیعت خراب ہونے لگی۔"
ان سب کی باتیں سن کر دادا دلدار کو اور بھی غصہ آگیا۔ انہوں نے پوچھا کہ تم یہاں کس لئے آئے تھے؟!!!"
ٹنکو میاں نے روتے ہوئے جواب دیا۔:
"چچا چوکیدار کے لئے انڈے لینے!"
"لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم اپنی پتلون کے لئے انڈے لینے آئے تھے، اب لے جاؤ یہ انڈے۔"
یہ کہہ کر "دادا دال مرچنٹ" نے ایک بڑے سے تھیلے میں سارے ٹوٹے ہوئے انڈے الٹ دیئے۔ اور کہا کہ:
"میں تمہارے ابا کو ان انڈوں کا اور برتن دھونے والے پاؤڈر کا، اور نمک کا اور صابن کا بل بھیج دوں گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ جو کام نہ آتا ہو اس میں ہاتھ ڈالنے کا کیا انجام ہوتا ہے؟!!!"
ٹنکو میاں نے بے بسی سے انڈوں کے چھلکوں کا تھیلا تھام کر ادھر ادھر دیکھا۔ ان کو دور سے "چچا چوکیدار" آتے ہوئے نظر آئے۔"
یہ دیکھتے ہی ٹنکو میاں "ارے باپ رے" کہتے ہوئے وہاں سے ایسے سرپٹ دوڑے کہ جیسے انہوں نے کوئی خوفناک بلا دیکھ لی ہو۔

سزا

مشرقی جرمنی کے ایک قصبہ میں ایک سرکاری باغ کے چاروں طرف خار دار تار کا جال لگا دیا گیا تھا جس میں برقی رو دوڑا دی گئی تھی اس تار کے ساتھ ایک بورڈ لگا دیا تھا۔ جس پر یہ الفاظ تحریر تھے، "جو کوئی اسے چھوئے گا فی الفور ختم ہو جائے گا۔" اس تحریر کے نیچے یہ الفاظ درج تھے، "خلاف ورزی کرنے والے کو ایک ہفتہ کی سزا دی جائے گی۔"
شاکر اللہ شاکر ڈیری کٹی خیل ..... نوشہرہ

شعروں میں ترکاریاں

شان الحق حقی

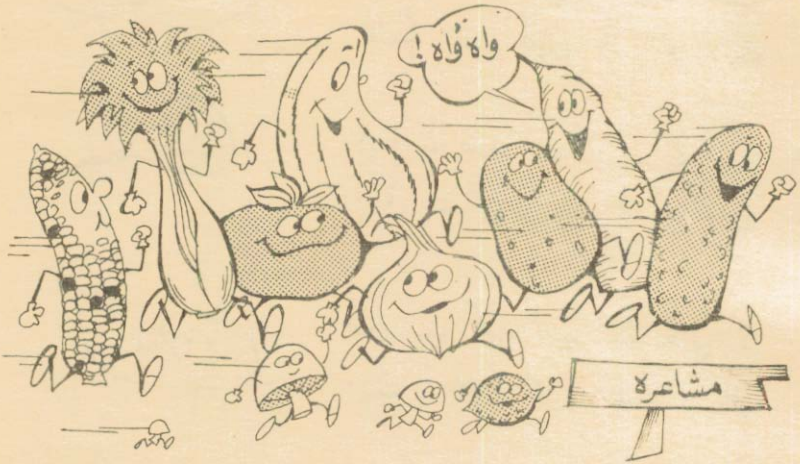

ان شعروں میں کچھ ترکاریوں کے نام چھپے ہوئے ہیں۔ سوچیے تو نظر آجائیں گے۔

●

پڑنے لگیں اب بوندیں آؤ
جلدی بھاگو بھیگ نہ جاؤ

علم سے ساتھ تمہارا نہ کبھی چھوٹے گا
یہ وہ دولت نہیں دشمن جسے آلوٹے گا

آؤ گھر میں ہمارے بی مکھی
یوں بلاتی ہے مکر سے مکڑی

خادموں نے پلاؤ قورمہ کے
خوانچے اور طباق لا سے رکھے

بی بی نہ خادمہ کے اگر منہ لگا کرے
بی بی سے بھی نہ خادمہ ٹرٹر کیا کرے

اچھی ہے کھیر آپ نے چکھی ؟
دیکھئے بیٹھ نہ جائے مکھی

عزم ہے جمّی میاں کا فوج میں جائیں گے یہ
رفتہ رفتہ مارشل جمشید ہو جائیں گے یہ

بولا کاریگر بن جائیں گی میزیں دو
اس نے جب فیتے سے ناپا لکڑی کو

ڈھیر ہو جائے گا پی کر جانور
دودھ میں دو گرنکوٹن ڈال کر

سوچئے فائدہ سگریٹ میں ہے کیا
اس کو جس نے بھی پیا زہر پیا

تشریف ہمارے میلے میں ازراہِ کرم کل لائیے گا
کاریگری کے عمدہ نمونے دیکھ کے خوش ہو جائیے گا

مکھیو! تم سے ناک میں دم ہے تم پر خدا کی مار پڑے
بھاڑ میں جائے تمہاری بھن بھن ڈی ڈی ٹی کی پھوہار پڑے

جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں۔

جو آئے تھے ڈرانے خود ڈر کے بھاگ نکلے

غصے سے بھنّاتی دُلھن
نیکر میں شرماتا دُولھا

ڈنڈا ڈولی

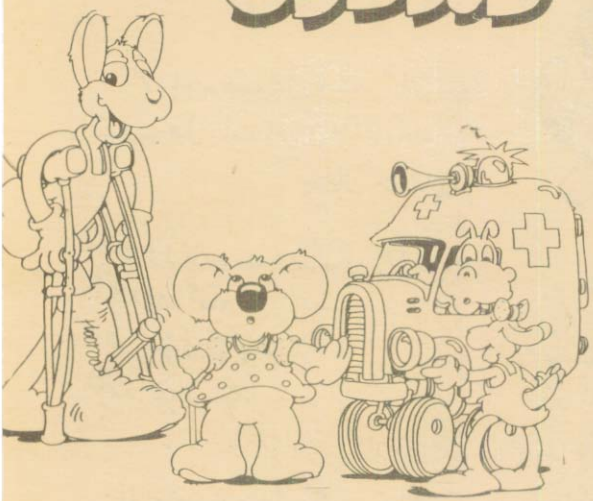

انعامی لطیفہ

استاد(شاگرد سے)

بیمار ہونا کو فقرے

میں استعمال کریں۔

شاگرد۔ اللہ کرے

آپ بیمار ہوجائیں۔

محمود محمد اشرف، کراچی

ایک اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے کاتب کو دو خبریں کتابت کے لئے دیں۔ پہلی خبر کچھ اس طرح کی تھی۔

"ڈاکٹر بش شہر کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال میں سول سرجن مقرر کر دیئے گئے"

دوسری خبر تھی۔ "شہر کے معزز افراد کا خیال ہے کہ سرکاری قبرستان کا احاطہ وسیع کر دیا جائے۔"

کاتب نے دونوں خبروں کو ملادیا۔ دوسرے دن اخبار میں یہ خبریں شائع ہوئی۔ "ڈاکٹر بش شہر کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال میں سول سرجن مقرر ہوگئے شہر کے معزز افراد کا خیال ہے کہ سرکاری قبرستان کا احاطہ وسیع کر دیا جائے۔"

ثناء اللہ۔ ضلع چکوال

ایک عورت اپنے دو بچوں کو ساتھ لے کر ایک سہیلی سے ملنے گئی چھوٹے بچے کو دیکھ کر سہیلی نے کہا۔

"اس کی آنکھیں بالکل ماں کی طرح ہیں۔"

"ہاں اور ماتھا باپ کا ہے۔" بچے کی ماں نے کہا۔

"اور پاجامہ بڑے بھائی کا ہے۔" اس بچے کے بڑے بھائی نے جو پاس ہی کھڑا تھا، کہا۔

سید فراز حسین کراچی،

استاد! (شاگرد سے) بزرگ کی جمع کیا ہے؟

شاگرد: بزرگان۔

استاد! بچے کی جمع کیا ہے؟

شاگرد! جڑواں بچے۔

مرسلہ ..... شہزاد حاجی عثمان

ایک صاحب اپنے بچے کو صبح سویرے اٹھنے کے فوائد بتا رہے تھے کہنے لگے کہ "تم نے دیکھا نہیں کہ جو پرندہ سب سے پہلے جاگتا ہے اسے سب سے زیادہ کیڑے مکوڑے کھانے کو ملتے ہیں۔" بچہ بولا "آپ نے کبھی سب سے پہلے جاگنے والے کیڑے مکوڑوں کی قسمت پر غور کیا؟"

مرسلہ سلطانہ خلیل ..... لاہور

مالک نے مزدور سے کہا۔ "میں نے تمہاری مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی ہے پھر تم ناخوش کیوں ہو؟" مزدور۔ "جناب آپ نے مزدوری ہی اتنی دی ہے کہ دوبارہ پسینہ آگیا ہے۔"

جنید اختر، کراچی

کراٹے سیکھ کر یہ چوہا کہہ رہا ہے
"میں اب بلی کو خود ہی دیکھ لوں گا"

بس میں کھڑا ایک مسافر دوسرے کھڑے ہوئے مسافر سے کہنے لگا۔

"جناب آپ کی عمر کیا ہے؟"

"۳۵ سال" دوسرے نے جھلا کر جواب دیا۔

پہلے مسافر نے بے ساختہ کہا۔ "اس عمر میں تو آپ یقیناً اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں، مہربانی کر کے میرے پیروں سے اتر جائیے۔"

مرسلہ:۔ محمد ارشد منہاس۔ کراچی

ایک ماہر نفسیات اپنے مریضوں کے سامنے رعب جمانے کے لئے اپنی خوبیاں گنوا رہے تھے کہ "میں کسی آدمی کو ملنے کے بعد اس سے صرف

ایک منٹ بات کر کے یہ جان سکتا ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے؟" لیکن یہ جان کر تو آپ کو کافی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہوگی" ایک صاحب نے کہا!

سید خالد حسین شاہ، لاہور

ایک شخص اپنے بیٹوں کو نصیحت کر رہا تھا بیٹا ہری مرچ کھالینا۔ انڈے ہر گز نہ کھانا بیٹے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیوں ابا جان۔"؟

"کل میں بازار سے گزر رہا تھا۔ تو دیکھا راستے میں دو مرغیاں لڑ لڑ کر لہو لہان ہو گئیں تو میں نے سوچا انڈے دینے والوں کا جب یہ حال تو کھانے والوں کا کیا حال ہو گا۔"

عظمیٰ عقیل فاروقی ...... سکھر

استاد (شاگرد سے) کوئی اسم بتاؤ؟

شاگرد:۔"کتا۔"

استاد:۔"کوئی اور اسم بتاؤ"؟

شاگرد:۔"کوئی اور کتا۔"

یاسمین ناز، کراچی

استاد نے شاگرد سے پوچھا "انڈا مذکر ہے یا مونث؟" شاگرد نے اطمینان سے جواب دیا "اس بات کا انحصار اس پر ہے کہ انڈے کے اندر مرغا ہے یا مرغی!"

کاشف طاہر...... ریاض۔ سعودی عرب

ایک بچے کو سوال پوچھنے کی بہت عادت تھی ایک مرتبہ نوکرانی سے کانچ کا گلاس ٹوٹ گیا تو ماں نے کہا "کم بخت اتنا اچھا گلاس توڑ دیا۔" بچے نے پوچھا کہ کم بخت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ ماں نے سوچا بچہ کہیں گالی نہ سیکھ جائے جھوٹ بول دیا کہ کم بخت کے معنی ہیں "صحت مند"۔

اگلے دن پھر کوئی برتن ٹوٹا تو ماں نے منحوس کہہ کر نوکرانی کو گالی دی۔ بچے نے پھر پوچھا "امی منحوس کا کیا مطلب ہوتا ہے، ماں نے کہا کہ "کمزور"۔

کچھ دن بعد یہ بچہ ماں کے ساتھ اپنی بیمار نانی کی مزاج پرسی کے لئے گیا تو نانی کو دیکھ کر بولا "نانی، نانی" پہلے تو آپ کم بخت تھیں اب تو بہت ہی منحوس ہو گئی ہیں۔

حنا بشیر..... کراچی

سید انشاء ایک دن نواب سعادت علی خان کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے اتار کر رکھ دی تھی۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت مچل گئی اور پیچھے سے ایک دھول ماری۔ آپ نے جلدی سے دستار سر پر رکھ لی اور کہا سبحان اللہ، بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھائیں تو شیطان دھولیں مارتا ہے۔"

مرسلہ :۔ خرم حسیب..... کراچی

ایک آدمی نے ہوٹل کے دروازے پر ایک چھکڑا سی کار لاکر کھڑی کر دی۔ اور ہوٹل کے ملازم سے کہا۔ "بھئی! ذرا کار کا خیال رکھنا۔" تھوڑی دیر کے بعد آدمی واپس آیا۔ تو اس نے ملازم کو دو روپے ٹپ دی۔ مگر ملازم نے مزید دو روپے کا مطالبہ کیا۔ آدمی نے پوچھا۔ "بھئی مزید دو روپے کس بات کے؟" ملازم بولا۔ "جناب! دو روپے تو ٹپ کے اور دو روپے شرمندگی کے، کیوں کہ جو بھی گزرتا تھا۔ کار کو دیکھ کر یہی سمجھتا تھا۔ کہ یہ شاید میری ہے۔"

فوزیہ اسحاق، کراچی

چند دوستوں نے پکنک کا پروگرام بنایا۔ ان میں سے ایک کسی دوکان پر ملازم تھا۔ اس لڑکے نے اپنے دوستوں میں سے ایک سے کہا۔ مجھے ڈر ہے کہ میرا مالک یعنی دکاندار کل مجھے چھٹی نہیں دے گا۔ اس لئے کل تم دکان پر گیارہ بجے آنا اور کہنا کہ میری دادی فوت ہوگئی ہے۔ اس طرح مجھے چھٹی مل جائے گی۔ وہ لڑکا اگلے دن نو بجے ہی دکان پر آگیا اور دکاندار سے کہنے لگا۔

"مجھے بہت ضروری کام سے جانا تھا۔ اس لئے میں جلدی آگیا ہوں۔ آج گیارہ بجے شہباز کی دادی کا انتقال ہوگا اس لئے برائے مہربانی آپ اسے گیارہ بجے چھٹی دے دیں۔"

مرسلہ ذیشان یوسفانی
میرپور خاص

بنانا چاہتا تھا میں تو انسان
مگر یہ کیوں گدھا سا ہوگیا

احمد (کمال سے) تم کو کون سی خوشبو پسند ہے

کمال : مٹھائیوں کی۔

مرسلہ : شاہد بلال۔ کراچی

انوکھی دنیا کے نرالے شاہکار

اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ کوئی عمارت زلزے کے نتیجے میں زمین میں دھنس گئی ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ زیر زمین راستہ مغربی جرمنی کے شہر فرینکفرٹ کا ہے اور اسے ڈیزائنر کے تخلیقی ذہن نے اس طرح بنا کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔

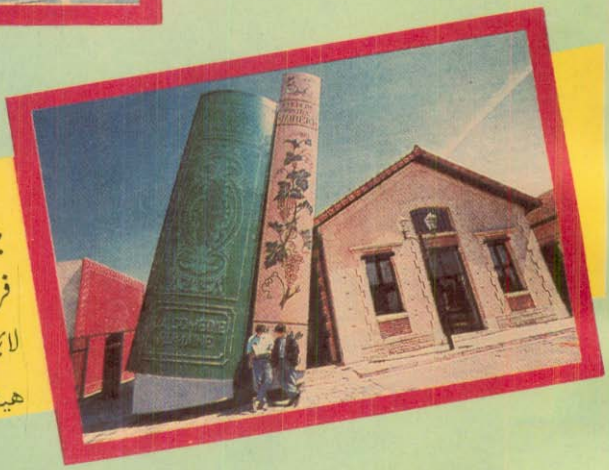

فرانس کے ایک شہر کی نیو لائبریری میں بنی ہوئی یہ بلند و بالا کتابیں فرنچ کلاسک کا حصہ بھی ہیں اور لائبریری کے کولنگ سسٹم اور ہیٹنگ یونٹ کا کمرہ بھی۔

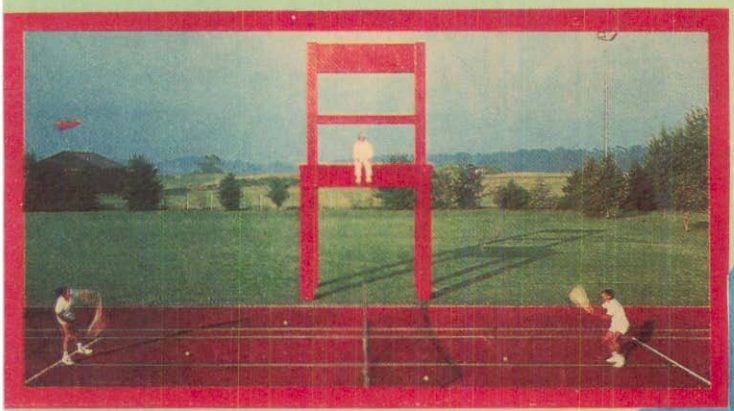

ریفری کے بیٹھنے کے لئے یہ ۲۶٫۲ فٹ اونچی کرسی سوئز کیمرہ کمپنی نے کلینڈر کے لئے تصاویر بنانے کی غرض سے بنوائی کہئے کیسی لگی آپ کو یہ کرسی ؟

دام باف مکڑیوں کا ایک پھندا جس میں چھوٹے
چھوٹے شکار پھنسے ہوئے نظر آرہے ہیں

جال کے اوپر تاروں کی نئی تہہ بتاتی ہے کہ جال
کے نیچے مکڑیوں کے آشیانے موجود ہیں

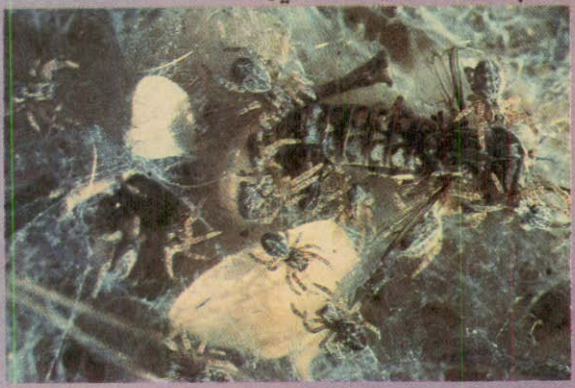

دام باف مکڑیاں ایک بڑے شکار سے نمٹ رہی ہیں۔

دام باف مکڑیاں

تلخیص و ترجمہ۔ اخگر انوار

اگر آپ کبھی خشک موسم میں جنوبی اور مشرقی افریقہ کے جنگلات میں گئے ہوں تو آپ کو وہاں خشک گھاس، بے پتا درختوں اور کیکر کے درختوں یا خاردار جھاڑیوں پر پھیلے ہوئے انتہائی باریک تار کے بڑے بڑے جالوں (Webs) کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آئی ہوگی۔ بظاہر ان جالوں

کا کوئی والی وارث نظر نہیں آتا اور یہ بڑے پرندوں اور ہوا کے جھکڑوں کے رحم و کرم پر پڑے نظر آتے ہیں جو جا بجا ان کی توڑ پھوڑ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جونہی اکتوبر آتا ہے، برسات کا پیغام لاتا ہے، درختوں پر پتے پھوٹنا شروع ہو جاتے ہیں، زمین کی گھاس ایک دفعہ پھر سرسبز ہو جاتی ہے تو ان پراسرار جالوں کے والی وارث اپنے آشیانوں سے نکل آتے ہیں اور ان کی مرمت شروع کر دیتے ہیں۔

یہ بڑے بڑے جالے دراصل کیڑوں مکوڑوں کو پھانسنے کے دام (Traps) ہیں اور ان کی والی وارث اسٹیگو ڈائفس (Stegodyphus) نامی مکڑیاں ہیں جنہیں ہم اردو میں پھندا بنانے والی یا "دام باف" مکڑیوں کا نام دے سکتے ہیں۔ عام طور پر گھروں میں پائی جانے والی مکڑیاں علیحدہ علیحدہ رہتی ہیں اور ہر مکڑی کا ایک جالا ہوتا ہے جسے وہ حشرات کو پھانسنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ لیکن دام باف مکڑیاں چونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح مل جل کر رہتی ہیں۔ اجتماعی آشیانے بناتی اور ان میں رہتی ہیں اور شکار کے لئے علیحدہ سے جال تیار کرتی ہیں۔ اسٹیگو ڈائفس لاطینی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد "مل جل کر رہنے والی"۔ چنانچہ اس لحاظ سے انہیں "معاشرت پسند" یا "مہذب" مکڑیاں بھی کہا گیا ہے۔

دام باف مکڑیاں اپنے آشیانے خار دار درختوں اور جھاڑیوں پر بناتی ہیں۔ یہ انگلیوں کے سائز سے لے کر فٹ بال کے سائز تک ہوتے ہیں۔ ہر آشیانے میں باریک تاروں کی ان گنت بھول بھلیاں ہوتی ہیں جن میں آشیانے کے سائز کے مطابق ۵۰ سے ایک ہزار تک مکڑیاں سما سکتی ہیں۔

مکڑیوں کی ہر کالونی میں اس طرح کم از کم تین آشیانے ہوتے ہیں۔ ان آشیانوں کے اوپر شاخوں پر یہ مکڑیاں مضبوط تاروں کا ایک جال سا بُن دیتی ہیں جس کا رقبہ دس سے پندرہ مربع فٹ تک ہوتا ہے۔ اور اسی جال کے ذریعے دام باف مکڑیاں شکار کرتی ہیں۔ جال میں مچھر سے لے کر پردار دیمک، چونٹیاں، ہر رنگ اور سائز کے بھنورے، خار دار ٹانگوں والے ٹڈے، باس کھٹل، حملہ آور کھٹل حتیٰ کہ مکڑی خور بھڑ تک پھنس جاتی ہے۔ اس طرح ان مکڑیوں میں ایک وقت میں ایک سے زیادہ "شکار" کو قابو کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ماہرین نے مکڑیوں کی ایک ایسی بستی کا مشاہدہ کیا جس نے اپنا جال ایک ایسی جگہ بنا رکھا تھا جو شہد کے چھتے کے قریب ہو جانے کی وجہ سے شہد کی مکھیوں کی گزر گاہ تھی۔ جب ایک مکھی اس میں پھنس جاتی تو وہ دوسری مکھیوں کو بلانے کے لئے ایک مخصوص قسم کی آواز نکالتی۔ اس کی مدد کو جو شہد کی مکھیاں آتیں وہ خود بھی اس دام میں پھنس کر رہ جاتیں۔ اس طرح مکڑیوں نے اچھا خاصا ذخیرہ خوراک جمع کر لیا۔

دام باف مکڑیوں کی ایک بستی مکڑی کے جسم

سے کئی گنا بڑے شکار کو بھی قابو کر سکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شکار کو قابو کرنے کے لئے ایک ہی وقت میں تمام مکڑیوں کو بستی سے باہر آنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باہر آنے والی مکڑیوں کی تعداد کا شکار کی پھڑپھڑاہٹ سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کوئی جانور پھنس جائے تو جال کی تاروں میں جتنا ارتعاش یا تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے اس سے اندازہ لگا کر مکڑیوں کی اتنی تعداد باہر آجاتی ہے جو اسے قابو کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اس طرح جتنا بڑا شکار ہو اتنی ہی زیادہ مکڑیاں باہر آتی ہیں۔

سب سے پہلے شکار تک پہنچنے والی مکڑیاں شکار کی ٹانگوں کو قابو کر کے انہیں کاٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ پھر اسے ڈنگ مار کر بے سدھ کر دیتی ہیں۔ اس دوران دوسری مکڑیاں بھی پہنچ جاتی ہیں جو شکار کو مخالف سمتوں سے کھینچ کر چیر پھاڑ دیتی ہیں۔ کچھ حصہ وہیں کھا لیا جاتا ہے اور باقی ذخیرے میں لے جایا جاتا ہے۔

دیمک اور شہد کی مکھیاں بھی معاشرت پسند حشرات ہیں لیکن ان کی بستیوں میں کام تقسیم شدہ ہوتا ہے۔ کارکن صرف کام کرتے ہیں۔ فوجی صرف لڑائی اور دفاع کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور ملکہ کا کام صرف انڈے دینا ہوتا ہے وغیرہ۔ لیکن دام باف چیونٹیوں میں اس قسم کی کوئی تقسیم کار نہیں ہوتی۔ ہر مکڑی جال بننے، شکار کو ٹھکانے لگانے اور دفاع وغیرہ میں حصہ لیتی ہے اور نسل بڑھانے کا کام بھی تمام مکڑیوں کے ذمہ ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر کام بڑا ''مؤثر'' ہوتا ہے کیونکہ یہ سب مل کر اسے سر انجام دیتی ہیں۔ ان کا پھندا بڑا مضبوط ہوتا ہے اور آندھیوں کے جھکڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی قائم رہتا ہے۔

دام باف مکڑیوں کی نسل بڑی تیزی سے بڑھتی ہے۔ ڈیڑھ سال کے اندر اندر ایک سو سے زائد نئی رہائشی بستیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ ایک بستی کے مکینوں کی تعداد بڑھتی ہے تو وہ کچھ عرصہ بعد قریب ہی میں ایک اور بستی ڈال کر دو بستیوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ مکڑیوں کی ایک پود زیادہ سے زیادہ ایک سال تک رہتی ہے لیکن اس کے قائم کئے ہوئے آشیانے اور دام آئندہ کئی نسلوں کے زیر استعمال رہتے ہیں۔

گرمیوں کے موسم میں ہر مادہ مکڑی ایک بڑا انڈہ دیتی ہے جس کے اندر پچاس چھوٹے چھوٹے انڈے ہوتے ہیں۔ بچے نکلنے تک وہ اس کی نگہداشت کرتی ہے۔ اس کے ارد گرد گھومتی اور بعض دفعہ اسے کھول کر اندر کے انڈوں کی خبر گیری کرتی رہتی ہے۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو مادہ چند ہفتوں تک اپنے معدے سے نیم ہضم شدہ خوراک نکال کر انہیں کھلاتی ہے اس کے بعد آہستہ آہستہ انہیں ٹھوس غذا، یعنی شکار کے جانور، پیش کرنا شروع کر دیتی ہے۔ بچے جوں جوں توانا ہوتے جاتے ہیں مادہ کمزور ہوتی جاتی ہے اور بالآخر

آشیانے کے اندر ہی مر جاتی ہے۔ اس وقت تک اس کے بچے اتنے بڑے ہو چکے ہوتے ہیں کہ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر اپنا علیحدہ آشیانہ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی بستیوں میں مسلسل اضافے کا عمل جاری رہتا ہے۔ کچھ بچے پرانے آشیانوں میں رہتے ہیں اور باقی نئے آشیانے بناتے اور بساتے ہیں۔

دام باف مکڑیاں سلیقہ مند اور باہنر ہونے کے باوجود بڑی سادہ لوح ہوتی ہیں۔ چند حشرات ایسے دیکھے گئے ہیں جو ان کے شکار میں اپنا مفت کا حصہ حاصل کر لیتے ہیں اور مکڑیوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ان حشرات کو اصطلاحاً کلیپٹو پیرا سائیٹس (Kleptoparasites) یا "لٹیرے" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک ارجی روڈ (Argyr-odes) یا نقرئی مکڑی ہے۔ اس کا رنگ اور جسامت ایسی ہوتی ہے کہ جال پر بیٹھی ہوئی شبنم کا قطرہ دکھائی دیتی ہے۔ دوسری قسم پورشیا (Portia) یا پھدک مکڑی کی ہے جو پھندے کے تاروں کے گچھوں میں کچھ اس طرح چھپ جاتی ہے کہ اس کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ دونوں کا کام پرائے شکار پر غارتگری کرنا ہوتا ہے۔ ماہرین نے مشاہدے کے دوران دونوں قسم کے لٹیروں کو اس طرح دام باف مکڑیوں کے پھندے پر جا کر شکار سے اپنا پیٹ بھرتے اور پھر چپکے سے واپس آتے دیکھا کہ "میزبانوں" کو ان "بن بلائے مہمانوں" کی آمد و رفت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

تاہم یہ لٹیرے مکڑیوں کے آشیانوں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ جرأت ایک اور قسم کے لٹیروں کے حصے میں آئی ہے یہ بھی مکڑیاں ہی ہوتی ہیں لیکن ان کا سائز چھوٹا ہوتا ہے۔ ان کا اصل نام آرکاہوڈکٹائنا (Archaeodictyna) ہے لیکن ایسے الووا (Ulova) بھی کہا جاتا ہے جس سے مراد ہے "لفنگی مکڑی"۔

ماہرین نے دام باف مکڑیوں کے ساتھ ان کے بچے بھی جال پر آتے اور واپس آشیانے میں جاتے دیکھے۔ لیکن ان کی چند عادات سے ماہرین کو کھٹکا لگا۔ تحقیق پر معلوم ہوا یہ ان کے بچے نہیں بلکہ لفنگی مکڑیاں ہیں۔ لفنگی مکڑیاں زبردستی کی مہمان ہوتی ہیں۔ وہ دام باف مکڑیوں کے آشیانوں میں ان کے ساتھ گھل مل کر رہتی ہیں۔ وہیں انڈے اور بچے دیتی ہیں اور "میزبانوں" کے شکار میں اپنا حصہ وصول کرتی ہیں۔ اس کے باوجود یہ شکار کو قابو کرنے میں میزبانوں کی کوئی مدد نہیں کرتیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفنگی مکڑیاں کس طرح باف مکڑیوں کو اتنا بے وقوف بنا لیتی ہیں کہ وہ ان کو اپنی بستی میں مٹر گشت کی کھلی چھٹی دے دیتی ہیں۔

سوال لفنگی مکڑیوں کی چالاکی کا نہیں باف مکڑیوں کی سادہ لوحی کا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں شہد کی مکھیوں یا دیمک کی ایک بستی میں کسی اور بستی کی شہد کی مکھی یا دیمک گھس آئے تو مکھیاں یا دیمک اسے زبردستی باہر نکال دیتی ہیں۔ لیکن باف مکڑیاں نہ صرف یہ کہ کسی دوسری بستی کی باف مکڑیوں کو

... اندر گھس آنے پر کچھ نہیں کہتیں بلکہ کسی اور قسم کی مکڑی بھی ان میں آکر رہنا شروع کر دے تو یہ اسے دھکے دے کر باہر نہیں نکالتیں اور نہ ہی اس کا کوئی نوٹس لیتی ہیں۔

بعض آبادیوں میں لفنگی مکڑیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ۲۹۷ باف مکڑیوں کے ایک آشیانے کا مشاہدہ کیا گیا تو ان میں سے ۶۴ لفنگی مکڑیاں نظر آئیں۔

دام باف مکڑیوں کا بھولا پن بعض اوقات انہیں دوسرے جانوروں کا شکار بھی بنا دیتا ہے۔ ایسے جانوروں میں سے سیوڈوپومی لس فیونیریس (Pseudopompilus funereus) نامی ایک بھڑ ہے جس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ خود پھندے میں قابو آئے بغیر اس پر بیٹھ سکتی ہے۔ جب یہ پھندے پر بیٹھتی ہے تو تاروں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مطابقت سے دو تین باف مکڑیاں جال پر دوڑی آتی ہیں۔ بھڑ ان میں سے ایک کو ڈنگ مار کر ادھ موا کر دیتی ہے اور جاتے جاتے اس کے سر پر انڈا دے جاتی ہے۔ گیارہ دن کے اندر اندر یہ لاروا، پیوپا بن جاتا ہے اور اپنی "میزبان" کے سر کا سخت حصہ تقریباً چٹ کر جاتا ہے۔ یہ خود ایک سخت خول میں بند ہوتا ہے اور ایک سال تک یونہی آشیانے میں پڑا رہتا ہے۔ اب یہ اتنا جوان ہو جاتا ہے کہ مکڑیوں کو خوراک بنانا شروع کر دیتا ہے ان میں سے کچھ جان بچانے کے لئے آشیانے کو خیر باد کہہ کر بھاگ جاتی ہیں۔ قدرت کا انتظام دیکھئے خود اس بھڑ کو کھانے کے لئے لوریما (Loryma) نامی ایک پتنگا ہمہ وقت اس کی تلاش میں آشیانے کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور جونہی یہ باہر نکلتی ہے اسے چٹ کر جاتا ہے۔

باف مکڑیوں کے جالوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تار عام مکڑی کے جالوں کے تاروں کی نسبت کافی مضبوط ہوتے ہیں۔ اور بعض پرندے اپنے گھونسلے بنانے کے لئے یہ تار جال سے چراتے رہتے ہیں۔

لیٹے ہوئے ہیں برف پہ   کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟

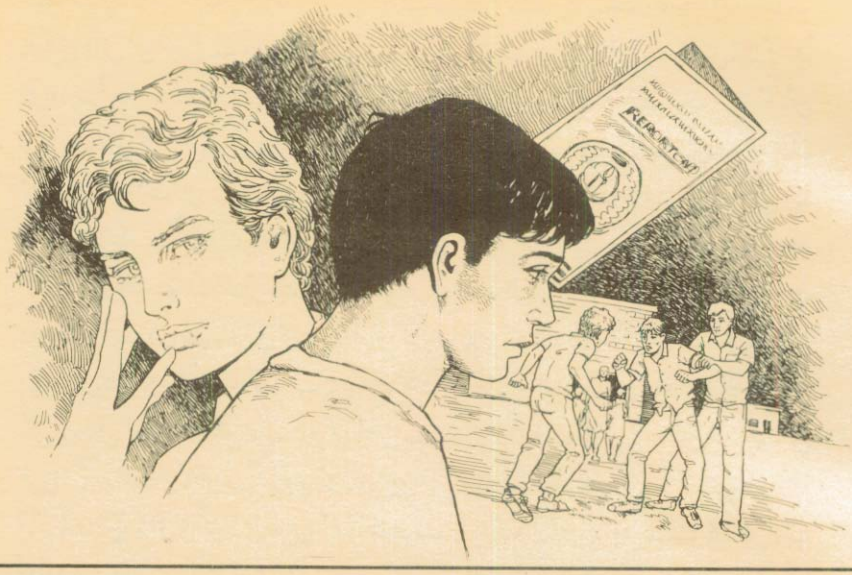

عمران مشتاق

بے نام خوف

آٹھویں جماعت کا غیر متوقع نتیجہ کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ نذیر ریاضی اور جنرل سائنس میں فیل ہو گیا تھا۔ ایک ایسے طالب علم کا جس کے بارے میں اسکول کے تمام ٹیچروں کا متفقہ خیال تھا کہ وہ بورڈ کے امتحان میں اسکول کا نام روشن کرے گا۔ فیل ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ایک ایسی انہونی تھی جس پر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ یقین دلانے کے لئے اگر رپورٹ کارڈ نہ ہوتی تو شاید کوئی مشکل سے ہی اس بات کو سچ سمجھتا۔ تمام ٹیچرز نذیر کی اس کارکردگی پر نہ صرف یہ کہ حیران و پریشان تھے بلکہ کافی ناراض بھی تھے۔ مجھے بھی نذیر کے فیل ہو جانے کے سخت افسوس تھا۔ وہ میرا بہترین دوست تھا۔ میں تو اس اسکول میں شروع سے پڑھ رہا تھا لیکن اس نے آٹھویں جماعت میں ہمارے اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ وہ کسی دوسرے شہر سے اپنے ابو کے ٹرانسفر کی وجہ سے ہمارے شہر میں آیا تھا۔ اس کا ساتویں تک کا ریکارڈ

اسے بہت اچھا طالب علم ظاہر کرتا تھا۔ اور اس نے بے حد مختصر عرصے میں اس بات کو ثابت بھی کر دکھایا۔ میں اپنی کلاس میں شروع سے اوّل رہا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے یہ اعزاز چھین لیا۔ پہلے ہی ماہانہ ٹیسٹ میں وہ چند نمبروں کے فرق سے اوّل رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اس وجہ سے اس سے نفرت کروں گا لیکن نہ کر سکا۔ کوئی بھی شخص اس سے نفرت کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی شخصیت تھی ہی اتنی پیاری من موہنی۔ ہر وقت اس کے چہرے پر دل موہ لینے والی معصوم سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ذہانت سے چمکتی رہتیں اور سب سے بڑھ کر اس کا نرم و شیریں لہجہ۔ وہ ٹیچروں کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ہر ایک سے اچھے اخلاق سے پیش آنا شاید اس کی عادت میں شامل تھا۔ ہم دونوں جلد ہی دوست بن گئے۔ ہم دونوں میں کچھ ایسی محبت پیدا ہو گئی کہ ایک دوسرے کے بنا رہنا مشکل لگتا۔ پہلی بار تعلیمی میدان میں نذیر جیسا حریف ملا تھا۔ اب میں سخت محنت کرتا تھا۔ اور اب ہوتا یوں تھا کہ ماہانہ ٹیسٹوں میں کبھی نذیر اوّل آجاتا تھا اور کبھی میں۔ نذیر کو سائنس بے حد پسند تھی اسے انجینئر بننے کا شوق تھا۔ اور جس طرح سے وہ محنت کرتا تھا سب کو یقین تھا کہ وہ اپنی منزل ضرور پالے گا۔ وہی نذیر سائنس میں فیل ہو گیا تھا۔ بات یقیناً حیرانگی کی تھی۔ آٹھویں کے امتحانات سے دو ماہ پہلے اچانک بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ میں جب بھی وجہ پوچھتا تو وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہ بتایا۔ میں یہ سمجھ کر چپ ہو گیا کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی گھریلو مسئلہ ہو۔

نتیجہ نکلنے کے ایک ہفتے بعد جنرل سائنس اور ریاضی کا دوبارہ امتحان ہوا۔ یہ امتحان ان لڑکوں کے لئے منعقد ہوا جن کے نمبر ان دونوں مضامین میں بہت کم تھے۔ دونوں مضامین میں پینتالیس فیصد نمبر حاصل کرنے والے لڑکوں کو سائنس مل جاتی اور وہ نویں جماعت کے سائنس سیکشن میں چلے جاتے۔ نذیر بھی اس امتحان میں شریک تھا۔ میں نے اس کے لئے بڑی دعائیں کیں۔ لیکن جب نتیجہ نکلا تو اس نے چالیس فیصد نمبر حاصل کئے تھے اور یوں اسے سائنس نہ مل سکی نذیر کو آرٹس گروپ میں بھیج دیا گیا۔

نذیر کے بغیر نئی کلاس مجھے چند دن تک اچھی نہ لگی۔ بہرحال چند روز میں میں عادی ہو گیا۔ میں اب سخت محنت کر رہا تھا کیونکہ اس بار امتحانات بورڈ کے تحت منعقد ہونا تھے اور میں کچھ کرنے کا عزم لئے ہوئے تھا۔ ہماری کلاس میں ایک لڑکا غلام محمد تھا۔ وہ دو سال سے ایک پیپر میں بھی کامیابی حاصل نہ کر سکا تھا۔ وہ صرف نام کا غلام تھا عملاً اس نے ساری کلاس کو غلام بنا رکھا تھا۔ سب لڑکے اس سے بے حد ڈرتے تھے۔ وہ کلاس میں سب سے لمبا اور اچھے ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ غصے کا اتنا تیز کہ ذرا سی بات پر بُری طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ سب ہی لڑکے اس سے خوف کھاتے اور اس کا کہنا مانتے تھے۔ دسویں جماعت کے مانیٹر اور نائب مانیٹر مجھے بتا چکے تھے کہ جب وہ کلاس میں مانیٹر تھے تو وہ غلام کی حرکتوں پر نہ تو کبھی ٹوکتے

تھے اور نہ ہی اس کی شکایت ٹیچروں سے کرتے تھے۔ انہوں نے یہی مشورہ مجھے بھی دیا کیونکہ مانیٹر اب میں تھا ہمارے اسکول میں کلاس مانیٹر اوّل آنے والا لڑکا ہی بن سکتا تھا۔ اور آٹھویں میں اوّل میں ہی رہا تھا۔

کلاس ٹیچر اسلم صاحب نے بھری کلاس میں جب میرے مانیٹر بننے کا اعلان کیا تو ان کا اعلان سن کر میں اپنی ڈیسک سے کھڑا ہوا اور کہا "سر میں مانیٹر نہیں بننا چاہتا آپ کسی اور کو مانیٹر بنا دیں۔" اسلم صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا وہ سخت حیران ہوئے تھے۔ کلاس مانیٹر بننا ایسا اعزاز تھا۔ جس کا خواہش مند ہر لڑکا تھا اور میں اس اعزاز کو ٹھکرا رہا تھا۔ "بشیر یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مانیٹر بننا تمہارا حق ہے تم کلاس کے سب سے اچھے لڑکے ہو۔ میں تمہارے سوا اور کسی کو مانیٹر نہیں بنا سکتا۔ مانیٹر تم ہی کو بننا ہو گا۔" اسلم صاحب نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "سر اگر آپ مجھے مانیٹر بنانا ہی چاہتے ہیں تو پھر میری ایک شرط ہے۔" "شرط۔ کیسی شرط....." اسلم صاحب نے حیرت سے دُہرایا۔ "سر نائب مانیٹر بنانے کا اختیار مجھے دیا جائے تو میں مانیٹر بن جاؤں گا۔" میرا مطالبہ سن کر اسلم صاحب سمیت ساری کلاس حیران رہ گئی۔ نائب مانیٹر دوم آنے والے طالب علم کو بنایا جاتا تھا۔ اب یہ حق میں مانگ رہا تھا۔ حیران تو سب کو ہونا ہی تھا۔ "تم کسے نائب مانیٹر بنانا چاہتے ہو؟" اسلم صاحب نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں پوچھا۔ "سر غلام محمد کو۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "غلام محمد کو؟" اسلم صاحب زور سے چیخے تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنے اوپر قابو پالیا۔ لیکن وہ اب بھی حیرت زدہ سے لگ رہے تھے۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ چند لمحوں تک وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ پھر دفعتاً مسکرانے لگے۔ "ٹھیک ہے آج سے نائب مانیٹر غلام محمد ہو گا۔" ان کا اعلان سن کر کلاس بھر کو سانپ سونگھ گیا۔ میری طرف اٹھنے والی کئی نگاہوں میں غصہ ہی غصہ تھا۔ لیکن میں اپنی اس پہلی جیت پہ مسکرا رہا تھا۔

ہاف ٹائم میں غلام میرے پاس آیا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟" "میں نائب مانیٹر بننے کے لائق نہیں ہوں۔" وہ بھاری لہجے میں بولا۔ "تم تو مانیٹر بننے کے لائق ہو جبکہ تمہیں تو صرف نائب مانیٹر ہی بنایا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے تم کلاس میں امن قائم رکھنے میں میری مدد کرو گے۔" میری بات سن کر وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا پھر میرے کاندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ دوستی کرو گے۔"

"دوستی کرو گے کا کیا مطلب؟ ہم دوست ہیں۔" اور ہم دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "غلام تمہیں پڑھائی میں کوئی بھی تکلیف ہو تو بلا دریغ مجھ سے پوچھ لینا اپنے دوست کی مدد کر کے مجھے خوشی ہو گی۔" غلام میری بات سن کر صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

نذیر اور میں ہاف ٹائم میں گھر سے لایا ہوا ناشتہ اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ ہماری دوستی پہلے ہی جیسی تھی۔ لیکن نذیر اب گم صم سا رہنے لگا تھا۔ وہ میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتا تھا۔ جس سے مجھے الجھن ہوتی۔ اس دن میں اور نذیر ناشتہ کرنے میں مصروف تھے میں سر جھکائے کھا رہا تھا کہ اچانک نذیر اپنا ناشتہ ٹفن میں رکھنے لگا۔ پھر وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں کلاس میں جا رہا ہوں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" یہ کہہ کر وہ چل پڑا میں آواز ہی دیتا رہ گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا میرے سر پر غلام کھڑا تھا۔ "آؤ غلام ناشتہ کرو۔" میں نے غلام کو ناشتے کی آفر کی۔ "نہیں تم کھاؤ۔ میرا کچھ کھانے کا موڈ نہیں یہ تمہارا دوست کیوں اٹھ کے چلا گیا۔" وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اس کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" "طبیعت ٹھیک نہیں تھی یا مجھے دیکھ کر....." وہ خاموش ہو گیا۔ "تم کوئی دیو تھوڑے ہی ہو۔ جو وہ تمہیں دیکھ کر ڈر جائے گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بشیر میری بات مانو گے۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"کہو اگر ماننے والی بات ہوئی تو انکار کبھی نہیں کروں گا۔"

"میری نذیر سے دوستی کروا دو۔ وہ ایک اچھا لڑکا ہے ـــ حالانکہ ہم دونوں ایک ہی محلے میں رہتے ہیں پھر بھی ہم دوست نہیں۔ میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو یہ کون سی بڑی بات ہے کل ہی تمہاری دوستی کروا دونگا۔"

جسے میں چھوٹی سی بات سمجھتا تھا۔ وہ واقعی بڑی بات ثابت ہوئی۔ میں نے نذیر سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اب وہ مجھ سے بھی کٹنے لگا۔ مجھے دیکھ کر کنی کترانے کی کوشش کرتا۔

ٹیچر کی غیر موجودگی میں غلام کی وجہ سے کلاس میں سے کسی قسم کا کوئی شور نہ ہوتا تھا۔ یوں غلام ہی کلاس مانیٹر تھا۔ وہ اب کافی سدھر گیا تھا۔ پڑھائی کی طرف بھی توجہ دینے لگا تھا۔ میں پڑھائی میں اکثر اس کی مدد کرتا تھا۔ کلاس میں دو تین بار مار پیٹ کی نوبت آئی۔ غلام سے پٹنے کے بعد بھی وہ لڑکے ٹیچر سے شکایت نہیں کرتے تھے۔ غلام میری بات کافی مانتا تھا۔ اس لئے میرے سمجھانے پہ اب مار پیٹ سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ لیکن چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اب بھی کبھار اس کے خلاف کوئی نہ کوئی شکایت تو ملتی ہی رہتی تھی۔

میں نذیر سے ملنے اس کے گھر جا رہا تھا۔ نذیر کی گلی میں ایک جگہ رش سا لگا ہوا تھا۔ قریب جا کر دیکھا تو غلام ایک لڑکے کی خوب پٹائی کر رہا تھا۔ وہ لڑکا مار بھی کھانے جا رہا تھا اور چلا بھی رہا۔ "اونٹ.....

اونٹ..... اونٹ۔" "غلام کیا کر رہے ہو۔ کیوں اس لڑکے کو مار رہے ہو؟" میں راستہ بناتا ہوا غلام کے پاس جاکر بولا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔ "بشیر تم مجھے ہمیشہ کہتے ہو کہ میں جھگڑا نہ کیا کروں۔ میں اب جھگڑا نہیں کرتا ہوں لیکن محلے کے لڑکے مجھے اونٹ اونٹ کہہ کے چھیڑتے ہیں۔ یہ لڑکا اسد مجھے روز چھیڑتا ہے۔ آج مجھے غصہ آگیا تو میں نے اس کی پٹائی کر دی۔ یہ سب اس لئے شیر ہو گئے ہیں کہ اب میں لڑائی نہیں کرتا میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی سے نہ الجھوں، غلام کا لہجہ شکایتی ہو گیا۔ "چھوڑو دوست! میں نے تمہارا گھر تک نہیں دیکھا چلو آج تمہارے گھر چلتے ہیں۔" میں نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں..... ہاں..... ضرور میرا گھر پاس ہی ہے۔" غلام کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں وہ مجھ سے کئی بار گھر آنے کا کہہ چکا تھا۔ لیکن میں آج تک اس کے گھر نہیں گیا تھا۔ غلام کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میری نظر نذیر پہ پڑی وہ لڑائی کے مقام سے کافی دور کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اشارہ کر کے اسے اپنے پاس بلایا لیکن وہ منہ پھیر کے گھر کی جانب چل پڑا۔ "مجھے یہ بات بُری لگی لیکن میں نے دل کو یہ سوچ کر سمجھا لیا کہ واپسی میں نذیر کے گھر جانا تو ہے ہی اس وقت اس سے پوچھ لوں گا۔" غلام کے گھر سے نکل کے جب میں نذیر کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا وہ گھر میں نہیں ہے۔ میں کافی دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آیا۔

..... ○ .....

نویں کے امتحانات کا نتیجہ نکلا تو میں نے اسی فیصد سے زائد نمبر لے کر کلاس میں اول پوزیشن لی تھی۔ نذیر نے آرٹس گروپ میں ہوتے ہوا ٹھتر فیصد نمبر لے کر شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن وہ اس کامیابی سے خوش نہیں تھا۔ اس نے پاس ہونے کی خوشی میں مٹھائی تک نہ کھلائی۔ اس بار غلام بھی پاس ہو گیا تھا گو کہ اس کے نمبر واجبی سے تھے۔ لیکن اس کے لئے تمام مضمونوں میں پاس ہو جانا کسی کارنامے سے کم نہ تھا۔ یہ ویسے بھی اس کا آخری چانس تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ اس بار بھی فیل ہوا تو وہ اسے اسکول سے نکال دیں گے۔ وہ اس کامیابی پر میرا شکر گزار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال اور بیت گیا۔ میٹرک کے امتحانات ہوئے بھی اور ان کا نتیجہ بھی نکل آیا۔ میں نے اے ون گریڈ میں کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن اصل کامیابی تو نذیر کی تھی اس نے آرٹس گروپ میں نہ صرف یہ کہ اے ون گریڈ حاصل کیا تھا بلکہ میرٹ لسٹ میں بھی اس کا نام تھا۔ غلام بھی سیکنڈ کلاس میں میٹرک کر چکا تھا۔ اور اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

..... ○ .....

نذیر نے میٹرک میں کامیابی کی خوشی میں اپنے گھر پارٹی دی تھی مجھے بھی اس نے مدعو کیا تھا حالانکہ

اب ہماری دوستی میں پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ اس دن میں نے پورے دو سال بعد نذیر کو اتنا خوش دیکھا۔ وہ بات بات پہ قہقہے لگا رہا تھا۔ لگتا تھا پہلے والا نذیر لوٹ آیا ہو۔ وہی مسکراتے لب، چمکتی آنکھیں اور نرم و شیریں لہجہ۔ وہ مجھ سے پہلے ہی کی طرح ہنس بول رہا تھا۔ اور میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے میرے دوست کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ واپس لوٹا دی۔ پارٹی کے بعد سب دوستوں کے جانے کے بعد ہم دونوں نذیر کے کمرے میں چلے آئے "اور یار اب بتاؤ کہ آئندہ کا کیا پروگرام ہے کس کالج میں داخلہ لو گے۔" میں نے پوچھا۔

"میں کالج آف کمرشل آرٹس میں داخلہ لوں گا، میں کمرشل آرٹسٹ ہی بننا چاہتا تھا۔" وہ کہیں دور کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا اور پھر جب بولا تو خوشی سے بھرپور لہجے میں "اور بشیر سب سے بڑی بات یہ کہ اب میرے کالج میں غلام داخلہ نہیں لے سکتا۔ وہ..... وہ اب دوسرے کسی کالج میں جائے گا اور میں اب اکیلا....." وہ جملہ پورا کئے بنا خاموش ہو گیا اس کے چہرے پہ کئی رنگ آئے اور گئے۔

اور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ "نذیر کا سائنس اور ریاضی میں جان بوجھ کر فیل ہونا، آرٹس میں داخلہ لینا، غلام کو دیکھ کے غائب ہو جانا۔ میری غلام سے دوستی کی وجہ سے بھی کترانا....." یہ سارے مناظر کسی فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پہ آتے چلے گئے۔ اور میں سوچنے لگا کہ کسی کی شخصیت اتنی دبی ہوئی بھی ہو سکتی ہے کہ اک معمولی سا خوف اس کے دل میں یوں گھر کر لے کہ وہ اپنے مستقبل کو بھی داؤ پہ لگانے کے لئے تیار ہو جائے۔

کامیابی کا راز

ہیڈ مسٹریس نے نیلوفر کو شاباشی دیتے ہوئے کہا "مجھے امید نہیں تھی کہ تم جیسی کھلنڈری لڑکی امتحان میں اول آ سکتی ہے۔ اگر تم اسی طرح محنت کرتی رہیں تو انشاء اللہ اگلی کلاس میں بھی اوّل آؤ گی"

نیلوفر نے سر جھکا کر بڑے ادب سے کہا "جی ہاں، اگر آپ بھی ابا جان کے پریس سے پرچے چھپواتی رہیں۔"

ظفر اقبال سومرو

جب ہم بنے مکینک

انور کلیم بلوچ

ایک دوست کی مدد سے ہم ایک ریڈیو مکینک کے شاگرد بن گئے۔ کچھ دنوں میں ہم ریڈیو کے بہت سے پُرزوں کو اس طرح جاننے لگے جس طرح ملک کے بچے غیر ملکی اداکاروں کو جانتے ہیں۔ اب ہم خود کو "پکّا مستری" سمجھنے لگے تھے اور بقول ہمارے دوستوں کے ہم پر ایک دورہ سا پڑنے لگا تھا کہ ہر بات کو ریڈیو کے کسی نہ کسی پرزے سے تشبیہ دینے لگے تھے۔ مثلاً ہمارے اسکول میں تقریری مقابلے کا اعلان ہوا۔ موضوع تھا۔ "دوست کیسا ہو.....؟" ہم نے بھی اپنا نام تقریر کرنے والوں میں لکھوا دیا۔ مقابلے والے دن ہم ہال میں موجود تھے۔ پہلے دو تین دوستوں نے تقریریں کیں مگر ہم نے نہیں سنیں کیونکہ ہمارا دھیان تو اپنی تقریر پر تھا۔ آخر میں ہمارا نام پکارا گیا اور ہم اسٹیج پر پہنچے اور تقریر کا آغاز ہکلا کر کیا۔ "اُس..... اُس..... استادانِ محترم!" ہماری اس ابتدا پر ہی سننے والوں نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ لیکن ہم نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی..... "دوست ایسا ہو جس کی دوستی سانیو ٹیپ ریکارڈر کی طرح پائیدار ہو....." لوگ اور ہنسنے لگے ہمارا حوصلہ بڑھا تو ہم نے پرزور طریقے سے کہا "جی ہاں! دوست ایسا ہو جس کی دوستی ایل اے ۴۴۴۰ کے آئی سی کی طرح نایاب ہو....." "کیونکہ سچا دوست وہی ہے جسے ہم ہر چینل پر سُن سکتے ہوں۔ جس سے تعلقات میں کوئی فنی خرابی پیدا نہ ہو۔ جناب والا! دوستی کا ایریل ہمیشہ اونچا رہنا چاہیے۔" ہم قہقہوں کی گونج میں بولتے چلے گئے۔ ہوش اس وقت آیا

جب ہمیں دوستوں نے اسٹیج سے لاکر کرسی پر بٹھایا اور ہمارے منہ سے پانی کا گلاس لگایا۔ اور شاید چہرے پر پانی کے کچھ چھینٹے وغیرہ بھی مارے۔ جب نتائج کا اعلان ہوا..... تو ہم حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ ہم آخر سے تیسرے نمبر پر آئے تھے.....!

کچھ دن بعد ہمارے ایک رشتے کے بھائی جان گھر تشریف لائے اور ہم سے مخاطب ہو کر کچھ فرمانے لگے ہم کچھ نہ سمجھے کیونکہ ان کے صرف ہونٹ ہل رہے تھے اور آواز نہیں نکل رہی تھی ہم نے کہا "بھائی جان! آپ کا ہیڈ خراب ہو گیا ہے جب ہی آواز نہیں نکل رہی۔"

"ہم سے بھی مذاق کرنے لگے؟" انہوں نے چیخ کر کہا جسے ہم بہ مشکل سن سکے..... ساتھ ہی ان کا تھپڑ ہمیں لگا جس سے ہماری آواز بند ہو گئی..... آپ ہی انصاف کریں کہ ٹیپ کا اگر ہیڈ ختم ہو جائے تو آواز نہیں نکلتی اور بھائی جان کے خراب گلے کو ہم نے ہیڈ سے تشبیہ دی تو ایسا کیا گناہ کر دیا؟ ایک دن ہم نے دیکھا کہ ہمارے ایک پڑوسی لاٹھی کے سہارے چل رہے ہیں یقیناً ان کے پیر صحیح کام نہیں کر رہے تھے ہمیں یاد آیا کہ ایک ریکارڈر میں کیسٹ نہیں چل رہا تھا تو استاد نے بتایا کہ کیسٹ والی جگہ جو دو پلیاں لگی ہوتی ہیں اگر وہ صحیح نہ ہوں تو کیسٹ نہیں چلتا۔ انہیں ٹھیک کرنے کے لئے ان میں اسپرنگ لگانا پڑتا ہے۔ استاد کی یہ بات یاد آتے ہیں ہم نے پڑوسی صاحب کو دور ہی سے پکارا "بھائی صاحب! آپ کی دونوں پلیاں کام نہیں کر رہی ہیں ان میں اسپرنگ لگوایئے....." چلتے چلتے پڑوسی صاحب اچانک پلٹے ہمارے نزدیک آئے ان کا ہاتھ گھوما اور ان کی لاٹھی ٹھیک ہماری کھوپڑی پر پڑی بعد میں پتا چلا کہ ہمارے ناک کی اسپرنگ یعنی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک اور واقعہ ہم آپ کو بتاتے چلیں۔ وہ یہ کہ ایک دن ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کسی ٹیپ کے نقشے میں الجھے ہوئے تھے کہ پڑوس کے ایک گھر سے رونے دھونے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں بھاگے بھاگے ان کے گھر پہنچے دیکھا کہ ایک بڑی عمر کے بابا چارپائی پر لیٹے آنکھیں بند کئے آرام فرما رہے ہیں جبکہ ارد گرد بہت سے لوگ رو کر چیخ کر انہیں بے آرام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے ان کی نبض دیکھی پھر سینے پر دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ کچھ محسوس نہ ہوا تو ہم بولے۔ "ان کا ٹرانسفارمر جل گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" سب حیرت سے بولے..... "ہم نے کہا۔ مطلب یہ کہ ان کے دل کی دھڑکن بند..... ابھی ہمارا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک صاحب کا کمانڈو مار کہ ہاتھ ہماری گدی پر پڑا اور ہمارا اپنا ٹرانسفارمر جلتے جلتے بچا۔ بولے "تو ایسا بولو نا مستری کے بچے....."

اور ہم اپنی گدی سہلاتے ہوئے واپس ہوئے تاکہ ابا جان سے پوچھ سکیں کہ ابا حضور! کیا آپ بھی مستری رہ چکے ہیں.....؟

لیزر

محمد عمران خان

جس سے دنیا کو تعمیر بھی
کیا جا سکتا ہے اور تباہ بھی

ایک سائنس دان ڈاکٹر آرتھر شولو نے ۱۹۶۰ء میں روشنی کی ایک نئی قسم دریافت کی جس نے ساری دنیا کو حیران کر دیا - یہ لیزر کی روشنی تھی۔ لفظ LASER سے مراد ہے۔ (LIGHT AMPLIFICA-TION BY STIMULATEDEMISSION OF RADIATIONS)

لیزر کا اصول بہت سادہ ہے جس طرح محدب عدسہ CONVEX LENS کے ذریعے سورج کی شعاعوں کو مرکوز کر کے کاغذ یا گھاس کو آگ لگائی جا سکتی ہے۔ اسی طریقے سے شعاع کو اتنا طاقتور بنا دیا جاتا ہے کہ وہ لمحوں میں سخت سے سخت دھات کو پگھلا دیتی ہے۔ عام روشنی سات رنگوں سے مل کر بنتی ہے لیکن لیزر صرف ایک رنگ کی ہوتی ہے۔ اگر عام روشنی کو منشور (PRISM) میں سے گزارا جائے تو وہ سات رنگوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر لیزر کو منشور (PRISM) میں سے گزارا جائے تو وہ تبدیل نہیں ہوتی یعنی جس رنگ کی لیزر منشور (PRISM) میں داخل کی جائے گی اسی رنگ کی لیزر باہر نکلے گی، دوسری بات یہ ہے کہ عام روشنی جوں جوں فاصلہ طے کرتی ہے اس کا پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے اور وہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اس کے برعکس لیزر شعاعیں مربوط شکل میں سفر طے کرتی ہیں۔ اور زیادہ فاصلہ طے کرنے کے باوجود اس کی قوت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی۔ عام روشنی اور لیزر کے پھیلاؤ کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں میساچوسٹس انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے جب چاند کی سطح پر لیزر ڈالی گئیں تو وہ

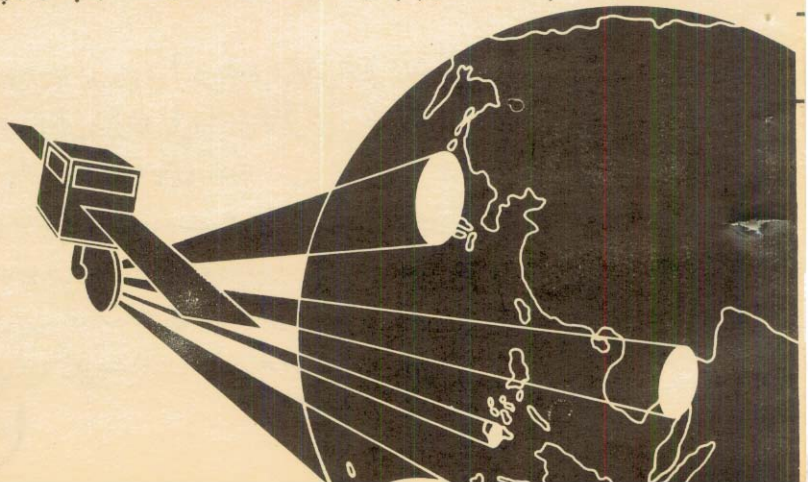

چاند کی سطح سے ٹکرا کر منعکس (REFLECT) ہوئیں اور تقریباً ۳۵ کلومیٹر تک پھیل گئیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم عام روشنی کو سرچ لائٹ کی مدد سے چاند پر ڈالیں تو وہ تقریباً ۳۸ سو کلومیٹر تک پھیل جائیں گی اور اس روشنی کو ریکارڈ کرنا ناممکن ہو گا۔

دنیا کی پہلی لیزر شعاع روبی کرسٹل کی مدد سے حاصل کی گئی تھی لیکن اب لیزر شعاعیں حاصل کرنے کے لئے مختلف قیمتی پتھروں، ہیرے جواہرات اور عدسے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔

لیزر کی دریافت اس صدی کی عظیم ترین دریافتوں میں سے ایک ہے گو کہ لیزر کی دریافت کو ابھی اتنا عرصہ نہیں گزرا لیکن زندگی کے ہر شعبے میں اس کا عمل دخل بڑی تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔

لیزر نے میڈیکل سائنس میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اب لیزر کے ذریعے انتہائی حساس اور نازک نوعیت کے آپریشن کرنا بھی ممکن ہو گیا ہے۔ ایک لیزر چاقو یا ٹارچ کے ذریعے نہ صرف آنکھ کے پردۂ بصارت میں پیدا ہونے والی باریک ترین رسولی کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے بلکہ اس سے آنکھ کے پردۂ بصارت کو آسانی سے جوڑا جا سکتا ہے۔

لیزر ایکسرے مشین پرانی مشینوں سے ۱۰ گنا واضح اور تفصیلی طور پر بیان کر سکتی ہے اور اسی کی بدولت بعض اقسام کے سرطان کا پتا لگایا جا چکا ہے اور ان کا باقاعدگی سے علاج ہو رہا ہے۔

لیزر سے مواصلات کے نظام میں بہت پیش رفت ہوئی ہے۔ چونکہ لیزر کی فری کیوئنسی (FREQUENCY) بہت زیادہ ہے۔

اس لئے اس کے ذریعے انتہائی پیچیدہ پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔ اصولی طور پر ایک لیزر شعاع وہ تمام اطلاعات لے جا سکتی ہے جتنی تمام ریڈیو چینل ملکر لے جاتے ہیں۔ ایک لیزر شعاع بیک وقت سات پروگراموں کو نشر کر سکتی ہے ایک لیزر شعاع سے انسائیکلوپیڈیا کا تمام مواد ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں نشر کیا جا سکتا ہے۔

لیزر ٹیلی ویژن اور لیزر وی سی آر میں تصویر کی کوالٹی انتہائی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں عالمی نمائش (EXPO) میں ہٹاچی لیزر ٹیلی ویژن کی نمائش بھی کر چکا ہے وہ دور اب دور نہیں جب مارکیٹ میں لیزر ٹیلی ویژن اور وی سی آر آ جائیں گے۔

لیزر کے مواصلاتی آلات کی مدد سے زمین اور چاند کے درمیان فاصلہ روزانہ ناپا جاتا ہے۔ اسی طرح زمین اور دوسرے سیاروں کے درمیان بھی فاصلہ ناپا جاتا ہے۔ زلزلوں کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلومات حاصل کر لی جاتی ہیں۔ اور کرۂ ارض کی ہلکی سے ہلکی حرکت بھی لیزر کے ذریعے ریکارڈ ہو جاتی ہے۔

ایک ٹیلی فون ایکسچینج سے ہزاروں دفاتر اور گھروں میں موٹے کیبل (CABLE) کے ذریعے رابطہ

قائم ہے اور ہر موٹی کیبل دو ہزار کالیں لیجانے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن لیزر کی بدولت اتنی ہی تعداد میں کالیں انسانی بال جتنے باریک تار کی مدد سے منتقل کی جا سکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فائبر گلاس (FIBRE GLASS)کی مدد سے سینکڑوں ٹیلیفون کالیں زیر آب لے جائی جا سکتی ہیں۔

لیزر کو اب ریڈار کے شعبے میں استعمال کیا جاتا ہے ایک ریڈار (مائیکرو ویو) ۷۵۰ کلو میٹر کے فاصلے پر موجود کسی جسم کا محل وقوع بتاتا ہے۔ اس میں ۳۰ میٹر تک غلطی کا امکان ہے۔ جبکہ لیزر میں اس کے استعمال سے ۷ میٹر تک غلطی کا امکان ہے۔ صنعتی میدان میں لیزر نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے، لیزر شعاعوں سے ہیرے جواہرات میں نفیس قسم کے سوراخ کئے جاتے ہیں۔ بڑی سخت دھاتوں لوہے کے ٹکڑوں اور بعض دوسری قسم کے دھاتوں کی کٹائی انتہائی خوبصورتی سے کرتی ہے۔

لیزر کو مونگ پھلی کا چھلکا اتارنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے لیزر سے ہولو گرافی میں ایک اہم پیش رفت ہوئی ہے اس سے تھری ڈائی مینشنل (THREE DIMENSIONAL)تصاویر اتاری جاتی ہیں۔ لیزر کو اب مصوری کے نادر نمونوں کے اصلی یا نقلی ہونے کے متعلق استعمال کیا جارہا ہے۔

لیزر کو توانائی کے ایک نئے ذریعے کے طور پر استعمال کرنے پر تجربات ہو رہے ہیں۔ طباعت کی صنعت میں بھی لیزر کا استعمال وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں فوٹو گرافی، الیکٹرک کیمرے، الیکٹرک کلر سیپیر میڈز کی تیاری میں لیزر کا استعمال ہو رہا ہے۔ عام روشنی کے کیمرے کی نسبت لیزر کیمرہ ۱۰ سے ۲۰ گنا زیادہ بہتر کارکردگی پیش کررہا ہے۔ پاکستان اور دوسرے ممالک میں اردو اخبارات اور رسائل کی طباعت اب لیزر سے ہو رہی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ملزم کی انگلیوں کے نشانات (FINGER PRINT)زیادہ آسانی اور بہتر طریقے سے تلاش کئے جاسکتے ہیں اور انہیں ایک بڑی ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک طرف تو انسان کی فلاح و بہبود کے لئے لیزر استعمال ہو رہی ہے۔ دوسری طرف اس کی تباہی کے لئے بھی کام ہو رہا ہے۔ اگر جنگ کے دوران لیزر شعاعوں کو دوسرے کسی شہر پر مرکوز کر دیا جائے تو وہ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ لیزر کی بدولت ایسی بندوقیں سامنے آئی ہیں جو ۱۰۰ کلو میٹر کی دوری پر کسی طیارے یا ٹینک کو تباہ کر سکتی ہیں۔ الغرض جنگی طیاروں، ٹینکوں، توپ خانوں، بحری جہازوں اور آبدوزوں کو لیزر سے لیس کیا جارہا ہے اور ان آلات سے دشمن پر ٹھیک نشانے لگانے میں بڑی مدد ملتی ہے امریکہ اور روس میں تو پہلے ہی اس میدان میں دوڑ شروع ہو چکی ہے اور اسٹار وار پروگرام میں لیزر کے ہتھیار کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ لیزر جس کی ایجاد کی بنیاد آئن اسٹائن کے دریافت کردہ ابتدائی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ انسانی خدمت کے لئے استعمال ہوتی ہے یا تباہی کے لئے۔

محمد صالح ارشاد

حیرت

۱)..... سب سے بڑا پرکار

جدہ شہر میں نصب یہ جیومیٹری کا سیٹ دنیا میں سب سے بڑا مانا جاتا ہے۔ اس کا کل وزن ۶۰ ٹن ہے۔ پرکار کی اونچائی ۱۲۲ فٹ ہے۔

۲)..... سب سے بڑی کیتلی

گلاسکو گارڈن فیسٹیول کی نمائش میں رکھی گئی دنیا کی سب سے بڑی چائے کی کیتلی اور پیالی اس کیتلی کی اونچائی ۱۲ فٹ ہے اور اس کا قطر ساڑھے سولہ فٹ ہے۔

۳)..... سب سے بڑی کرسی

۴۱ فٹ ۸ انچ لمبی اور ۲۳ فٹ ۹ انچ چوڑی یہ کرسی سوئزرلینڈ میں ۱۳ اپریل ۱۹۸۷ء کو نمائش کے لئے رکھی گئی۔

۴)..... سب سے بڑا ہینگر

اوریگون پائن اور پلائی وڈ کی مدد سے بنایا گیا یہ ہینگر (ICELAND) میں موجود ہے۔ اس کا وزن ۲۰۰ کے جی اور سائز 1.6ft × 15ft × 6.75ft ہے۔

۵)..... دنیا کی سب سے بڑی گاف اسٹک

جسے سوئیڈن کے باشندے گونار نے بنایا، یہ ۳٫۷۵ میٹر لمبی ہے جبکہ اس کا وزن ۴۰ کلوگرام ہے۔

۶)..... سب سے لمبی بوتل

کیلیفورنیا، امریکہ میں بنائی گئی یہ بوتل ۵۵ فٹ لمبی ہے۔

چھوٹے چھوٹے انسانوں کے
بڑے بڑے کارنامے!

تفصیلات سامنے کے صفحے
پر پڑھیے۔

اتنی بڑی پرکار
پھر بھی ہے بیکار

اس سیٹ میں سمائے
ایسا کہاں سے آئے؟

کھیلنے کو چاہئیں دو آدمی

کوئی ایسا بندہ آئے!
جو چائے سب پی جائے

ہینگر میں ٹانگنے کو لاؤں کہاں سے کیا؟

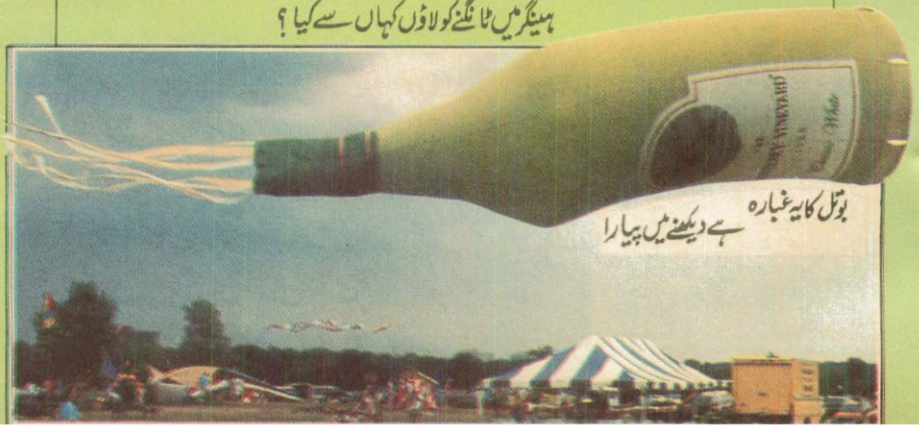

بوتل کا یہ غبارہ
ہے دیکھنے میں پیارا

عنبر چغتائی

جنگل کی بات

تھا سلطاں کوئی صاحبِ حوصلہ
شکار اس کا تھا مستقل مشغلہ

طبیعت پہ تھا اس کی بار ایک دن،
چلا بہرِ سیر و شکار ایک دن،

شکاری تھے کچھ ساتھ اس کے مگر
ہرن جب پہاڑی پہ آیا نظر،

تو گھوڑے کو اس نے اشارہ کیا،
اور اک پل میں نظروں سے اوجھل ہُوا

ہرن جھاڑیوں میں کہیں جا چھپا
وہ تنہا تھا بھوکا پیاسا کھڑا

لگا سوچنے پیڑکی چھاؤں میں: کہ ستائے جاکر کسی گاؤں میں!
کساں اتنے میں اک دکھائی دیا، جو آتا تھا سر پر لئے ٹوکرا
کہا اس سے "کیوں خیر ہے! دن ڈھلے کدھر چل دیئے، سرپہ کیا لے چلے!؟"
کہا "بیر ہیں یہ مرے باغ کے میں لایا ہوں سلطان کے واسطے"
کہا "پھر نہ سوچو، ہوئی تم سے بھول، کیا گر نہ سلطاں نے تحفہ قبول !؟"
"نہ لے، بھاڑ میں جائے!" اس نے کہا میں بازار میں جا کے بیچ آؤں گا!"

یہ سنتے ہی سلطاں روانہ ہُوا لئے ساتھیوں کو محل آگیا
شکاری تھا جو دشت و کہسار میں بڑی شان سے بیٹھا دربار میں
دیا حکم "دہقان اک آئے گا، ہمارے لئے تحفہ کچھ لائے گا
نہ آنے سے دربان روکے کوئی! خبردار، اس کو نہ ٹوکے کوئی!!"
کہ اتنے میں دہقان بھی آگیا، جو پوچھا "کہو، کیسے آنا ہوا!؟"
کہا بندگی کرنے آیا ہوں میں! تمہارے لئے بیر لایا ہوں میں!!"
وہ بولا کہ، "اک بات تم سے کہیں! تمہارا یہ تحفہ اگر ہم نہ لیں!؟"
یہی بات کی تھی شکاری نے بھی، نگاہوں میں صورت وہی پھر گئی
وہ پہچانتے ہی ادب سے جھکا، ذرا مسکراتے ہوئے پھر کہا
"تو سلطانِ عالم، وہی کل کی بات!
وہی واپسی والی جنگل کی بات!!"

تصویر بنانیوالا خود تصویر کا موضوع بن گیا
بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ....

محمد پرویز آرائیں

۹۔ اگست

آج اسکول میں ہم دوستوں کے درمیان ایسی بات چل نکلی جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ ذکر یہ ہونے لگا کہ کس کی ممّی کتنی اسمارٹ اور سوشل ہیں۔ میرے چاروں دوست بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ اقبال کی ممی ایک آرٹسٹ ہیں طاہر کی ممی مشہور ادیبہ ہیں امجد کی ممّی سوشل ورکر ہیں۔ اور سمیع کی ممّی ڈاکٹر ہیں۔ ایک میں ہی ایسا تھا جس کی ممّی کچھ بھی نہیں۔ نہ ہی تو وہ اتنی اسمارٹ ہیں کہ میرے دوست دیکھیں تو دیکھتے ہی رہ جائیں جس طرح میں امجد اور اقبال کی ممّی کو دیکھتا ہوں تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہوں مجھے وہ کسی فلم کی ہیروئن سے کم نظر نہیں آتیں۔ لیکن میری ممّی اف کتنی موٹی ہیں وہ اور اتنی ہی کالی بھی۔ ابو انہیں اپنے ساتھ کہیں بھی نہیں لے جاتے۔ وہ دن بھر گھر میں کام دھندے میں

لگی رہتی ہیں یہاں تک کہ بھینس کی دیکھ بھال بھی وہ خود ہی کرتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کام کرنے سے آدمی دُبلا ہوجاتا ہے لیکن میری ممّی دن بھر کام میں لگی رہنے پر بھی روز بروز پھولتی جارہی ہیں۔ دراصل وہ کھانے کی بہت شوقین ہیں۔ گھی دودھ اور مکھن کی گھر میں یوں بھی افراط ہے ویسے تو میں اپنی ممّی سے بہت پیار کرتا ہوں۔ آخر وہ میری ماں ہیں۔ لیکن کل سے مجھ پر ایک عجیب کوفت سوار ہے۔ اگر میری ممّی بھی امجد، اقبال، طاہر اور سمیع کی ممّی کی طرح کسی قابل ہوتیں تو میں حسرت سے اپنے دوستوں کا منہ تکنے کی بجائے اپنی ممی کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتا۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ ممی سے کہوں ممی آپ دبلی ہوجایئے۔ پلیز کسی بھی طرح کچھ کیجئے ممّی...... پڑھی لکھی تو آپ کم ہی ہیں کچھ سلائی کڑھائی میں ہی شہرت حاصل کیجئے کہ میں اپنے دوستوں میں فخر کے ساتھ گردن اٹھا کر کہہ سکوں کہ میری ممّی بھی کچھ ہیں۔ لیکن میں ممّی سے کچھ نہیں کہہ سکتا ڈر ہے کہ کہیں وہ جواب میں چپت رسید نہ کردیں۔

۱۰۔ اگست۔

آج میں چھٹی کے بعد اقبال کے گھر گیا تھا۔ اقبال سچ ہی کہتا ہے۔ اس کی ممّی واقعی بہت بڑی آرٹسٹ ہیں۔ میں جب وہاں پہنچا تو وہ برش لئے کینوس کے سامنے کھڑی تھیں اور بہت ہی خوبصورت پینٹنگ بنارہی تھیں۔ وہ اپنے آرٹ میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں کہ میرے آنے کا انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ نوکر نے پوچھے بغیر کھانا لگادیا۔ میں نے اور اقبال نے کھانا کھالیا۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی۔ میری ممّی تو دروازے پر میرا بے چینی سے انتظار کرتی ملتی ہیں۔ میں گھر پہنچتا ہوں تو مجھے پیار کرتی ہیں۔ کپڑے نکال کر دیتی ہیں اور خود مجھے کھانا نکال کر دیتی ہیں۔ میں کھاتا رہتا ہوں اور وہ پیار سے مجھے دیکھتی رہتی ہیں بجلی نہ ہو تو پنکھا جھلتی ہیں۔ میں بھوک سے کچھ زیادہ ہی کھا جاتا ہوں۔ کھانا ہی اتنا مزیدار ہوتا ہے۔ لیکن اقبال کے گھر کا کھانا مجھے پسند نہیں آیا۔ نِرا اُبلا ہوا کھانا۔ نہ مرچ نہ مصالحہ۔ اقبال کہتا ہے کہ ممّی تلا بُھنا کھانا قطعی پسند نہیں کرتیں۔ اس سے موٹاپا چڑھتا ہے۔ بات تو شاید ٹھیک تھی لیکن ایسا بدمزہ کھانا؟ مجھے بہت بھوک لگی تھی۔ کھانا دیکھ کر میری بھوک اڑ گئی اقبال نے بھی ذرا سی دال اور دو چپاتیاں کھائیں اور اٹھ گیا۔ پیٹ کیسے بھرتا باہر جاکر چاٹ پکوڑے کھائے۔ اب میں سمجھا اقبال اتنا دبلا پتلا کیوں ہے اور اس کا پیٹ اکثر خراب کیوں رہتا ہے۔

۱۲ اگست۔

آج جمعہ ہے۔ طاہر اور سمیع میرے گھر آئے تھے۔ مجھے اپنی ممّی سے اپنے دوستوں کا تعارف

کراتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ کیا سوچتے ہوں گے امجد اور سمیع میری ممّی کے بارے میں کتنی موٹی ہیں اس کی ممّی۔ لیکن ممّی کتنی خوش تھیں۔ دوڑ دوڑ کر میرے دوستوں کی خاطر کر رہی تھیں۔ کبھی چھاچھ لاکر پلاتیں۔ کبھی پاس بٹھا کر باتیں کرتیں۔ کبھی ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتیں طاہر اور سمیع ممّی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ کھانے پر ممّی نے کئی چیزیں تیار کی تھی طاہر اور سمیع کھانے پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے انھوں نے ایسا کھانا کبھی نہ کھایا ہو میں حیرت سے انھیں تک رہا تھا دونوں ایک ایک نوالے پر تعریف کرتے جاتے تھے طاہر بولا "آنٹی "اتنا اچھا کھانا میں نے آج تک نہیں کھایا اب تو میں ہر جمعہ کو آپ کے یہاں آیا کروں گا۔ سمیع نے کہا ہاں آنٹی! میری ممّی تو آج بھی ہسپتال گئی ہیں اور نوکر کھانا بہت بد مزہ بناتا ہے پھر مجھے کھانا بھی اکیلے ہی پڑتا ہے۔ ابو اور ممّی کے آنے کا کوئی ٹائم تو ہے نہیں جب مریضوں سے فرصت ملے گی تب ہی آئیں گے نا۔ اوہ آنٹی آپ کتنی اچھی ہیں۔ کاش ہماری ممّی بھی.....

۱۲۔ اگست

آج میرا برتھ ڈے تھا تینوں دوست آگئے لیکن امجد نہیں آیا۔ نہ جانے کیوں؟ آنے کا وعدہ تو کیا تھا اس کے بغیر پارٹی میں لطف نہیں آیا۔ وہ لطیفے سنا سنا کر خوب ہنساتا ہے۔ آج وہ میرے گھر کے چھولے اور دہی بڑے کھاتا تو بہت خوش ہوتا۔

۱۳۔ اگست

میں نے امجد سے خفا ہو کر پوچھا" کل تم کیوں نہیں آئے تھے؟" تو وہ اداس ہو کر بولا میں کیسے آتا۔ ممّی غریب بچوں کی مدد کے لئے ایک شو کا انتظام کرنے میں مصروف تھیں جب ممّی کہیں چلی جاتی ہیں تو چھوٹی بہن گڑیا کو مجھے ہی دیکھنا پڑتا ہے۔ ابّو دورے پر گئے ہوئے تھے ممّی رات کو دس بجے واپس آئیں۔ میں رویا تو بہت مگر کیا کرتا"

۱۴۔ اگست

آج اسکول میں یوم آزادی بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک نئے انعامی مقابلے کا اعلان بھی کیا جو ہر سال ۱۴ اگست کو ہوگا اس روز اسکول میں ایک بچّے کو بہترین صحت کے لئے انعام دیا جائے گا۔ کیونکہ صحت مند اور طاقتور بچے ہی ملک کی ترقی اور خوش حالی کے

ضامن ہیں وہی ملک کو آگے بڑھا سکتے ہیں وہی وقت پڑنے پر ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اور اس سال اسکول کے بہترین صحت مند بچے کا خطاب مجھے ملا میں آج بے حد خوش ہوں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہوں واقعی میں صحت مند ہوں۔ لمبا، طاقتور، چہرے پر سرخی۔ آنکھوں میں چمک۔ اوہ میں تو کسی مشہور آرٹسٹ کی تصویر لگتا ہوں۔ اور وہ آرٹسٹ میری ماں..... میری کالی موٹی ممّی۔ جنھوں نے اپنے پیار سے مجھ میں صحت کا رنگ بھرا ہے ہاں آج میں فخر سے گردن اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میری ممّی سب کی ممّی سے اچھی ہیں۔ وہ مائیں بے جان تصویروں میں رنگ بھرتی ہیں لیکن میری ممی سب سے بڑی آرٹسٹ ہیں۔ وہ جاندار تصویروں میں رنگ بھرنا جانتی ہیں۔

اعلان

پیارے بیٹے جب سے تم گھر سے بھاگ کر گئے ہو تمہاری والدہ کی طبیعت ٹھیک ہوتی جارہی ہے ہمسایوں نے بھی سکون کا سانس لیا ہے۔ اس لئے تم جہاں کہیں بھی ہو خدا تمہیں خوش و خرم رکھے اور تمہارے بدلے ہمیں بھی خوشی نصیب ہو۔

انعام

ایک بڑی فرم نے اپنے ملازمین کو پیش کش کی کہ وہ لوگ دفتر کے اخراجات کم کرنے کے طریقے بتائیں جس ملازم کا طریقہ سب سے اچھا ہوا اسے پانچ سو روپے بطور انعام دیئے جائیں گے۔

ایک نئے ملازم نے یہ کہہ کر مقابلہ جیت لیا کہ "انعام کی رقم سو روپے سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے"۔

(احمد رضا..... کراچی)

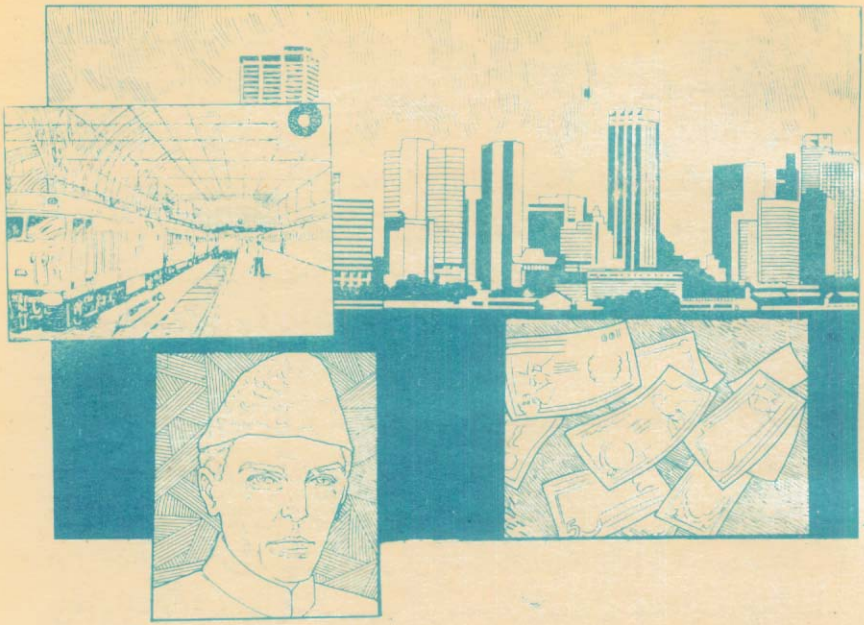

چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے نتائج

ادارہ

یہ مضمون آج سے سو برس پہلے تحریر کیا گیا تھا۔

بعض نادان بچے سمجھتے ہیں کہ ایک ذرا سی چیز ایسی بے حقیقت ہوتی ہے کہ اس کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ مگر یہ ان کی بڑی غلطی ہوتی ہے۔ دنیا میں ذرا ذرا سی چیزوں کے بڑے بڑے نتیجے پیدا ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں ہر ایک چھوٹی سے چھوٹی چیز کو دیکھ کر بھی غور کرنا چاہئے۔ کہ اس سے کیا بھلا یا بُرا نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے۔

جس طرح بارش کے ایک ایک قطرہ سے دریا اور سمندر بن جاتے ہیں اور ایک ایک دانہ سے کھلیان بنتا

ہے ایسے ہی ایک ایک لمحہ کے جمع ہونے سے آدمی کی عمر بن جاتی ہے اس لئے جب تک کسان گیہوں کے ایک ایک دانہ کی پروانہ کرے وہ کبھی اناج جمع نہیں کر سکتا۔ اور نہ وہ شخص اپنی عمر سے کوئی فائدہ کی بات پیدا کر سکتا ہے جو اس کے ہر منٹ اور ہر گھنٹہ کو احتیاط کے ساتھ اچھے کاموں میں نہ خرچ کرے۔

بعض بچے سمجھتے ہیں کہ بارہ گھنٹوں کے دن میں سے اگر چار گھنٹے ہر روز ضائع کر دیں تو کونسی بڑی بات ہے۔ لیکن اگر وہ حساب لگا کر دیکھیں گے تو حیران ہو جائینگے کہ انہوں نے اپنی عمر کا تیسرا حصہ کھو دیا ایک نہایت محنتی اور وقت کی قدر جاننے والا شخص جو ہر روز کھانا کھانے میں ایک گھنٹہ خرچ کرتا ہے۔ جب پچاس سال کا ہو گا تو اسے تعجب ہو گا کہ اپنی قیمتی عمر کے **کئی** سال اور **کئی مہینے** تو اس نے صرف کھانا کھانے میں ضائع کر دیئے۔

ایک بچہ کے پیدا ہونے پر اس کی ماں ہر روز دو پیسے اس کے لئے ایک صندوقچہ میں جمع کرنے لگتی ہے۔ جب بچہ کچھ بڑا ہوتا ہے تو وہ دو پیسے اس کو دیکر ہر روز ترغیب دیتی ہے کہ وہ بھی اسی صندوقچہ میں جمع کیا کرے کہ جس میں اس کا خزانہ پڑا ہوا ہے۔ آخر وہ پندرہ سال کی عمر تک ایسا ہی کرتا رہتا ہے۔ اب جو اس صندوقچہ کو کھول کر دیکھتے ہیں تو اس میں ایک بڑا سا پیسوں کا ڈھیر پایا جائیگا۔ اور جب حساب کیا جائیگا تو یہ ایک سو اکہتر روپے ڈیڑھ آنہ کے پیسے نکلیں گے۔ جو غریب آدمی کے لئے ایک خاصی رقم ہے۔

ایک دفعہ انگلستان کے ایک حساب دان نے ایک حساب لگایا تھا کہ اگر دنیا کی پیدائش کے زمانہ سے ایک پنس یعنی ایک آنہ کو سودی قرضہ پر لگا دیا جاتا اور ہر سال سود در سود کا حساب جاری رہتا تو آج اس سے اتنی بڑی رقم بن جاتی کہ ساری دنیا کی دولت اسے بمشکل ادا کر سکتی۔

بعض بے سمجھ لڑکے لڑکیاں کسی چھوٹی سی آزمائش کے وقت ذرا سا جھوٹ بول دیتے ہیں یا کوئی اور گناہ مثل ذرا سے فریب یا چھوٹی سی چوری کر بیٹھتے ہیں۔ اور دل میں خیال کرتے ہیں کہ یہ ذرا سی بات ہے۔ اس سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ مگر جس طرح ذرا سے خمیر سے سارا آٹا خمیر ہو جاتا ہے۔ یا جس طرح ذرا سے زہر سے جو سانپ کے ایک ڈنگ سے آدمی کے بدن کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سارا خون زہر آلود ہو کر آدمی مرجاتا ہے۔ اسی طرح ذرا سے گناہ کی آلودگی سے انسان کو بڑے بڑے گناہ کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ گناہ کے ناپید اکنار دریا میں ڈوب جاتا ہے۔

امریکہ کا ایک دانش مند حکیم لکھتا ہے کہ یہ کر لینا تو بڑا آسان ہے کہ میں ذرا سے کپڑے اچھے پہنا کروں۔ یا ذرا سا مکان اچھا کرائے پر لے لوں۔ یا کھانے پینے پر ذرا سا خرچ زیادہ کروں۔ مگر اس ذرا سے خرچ کے بڑھ جانے سے بہت لوگ تباہ ہو گئے ہیں۔ اور ایسے ڈوبے ہیں کہ کبھی نہیں ابھرے۔

دنیا میں آج علم کتنا لمبا چوڑا موجود ہے جس کے بے شمار فائدے ہیں مگر اس کا ہر ایک ذرہ ایک ایک وقت میں ایک ایک شخص کی کوششوں سے جمع ہوا ہے ایک شخص نے کشش ثقل کا مسئلہ دریافت کیا۔ ایک نے برقی رو کو معلوم کیا۔ ایک اور نے علم آب اور ایک اور نے علم کیمیا کا ایک اصول معلوم کیا۔ یہاں تک کہ آج علم اتنا لمبا چوڑا جمع ہو گیا کہ کوئی شخص اس پر پورے طور پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

اگر علم کی ایک ذرا ذرا سی حقیقت دریافت نہ کی جاتی تو آج اس بیش قیمت چیز سے آدمی محروم رہ جاتے۔

کسی بڑی عمارت کو دیکھو تو معلوم ہو گا کہ ایک ایک اینٹ کے دوسرے پر چن دینے سے یہ آسمان سے باتیں کرنے والی عمارت تیار ہوتی ہے۔ اس کی ہر ایک اینٹ کیسی بے حقیقت ہے۔ مگر ایک جگہ جمع ہو کر ایک نئی شان پیدا کر دیتی ہے۔ یہی حال مصر کے عظیم الشان میناروں کا ہے جو دنیا بھر میں سب سے بڑی عمارتیں مانے جاتے ہیں۔ مگر ایک ایک پتھر نیچے اوپر رکھ کر بنائے گئے ہیں۔

سمندر کی تہ میں مونگا ایک چھوٹا سا کیڑا ہوتا ہے۔ مگر جب بہت سے مونگے ایک جگہ جمع ہو کر مرتے رہتے ہیں تو ان کا ڈھیر اتنا بلند ہوتا ہے کہ سمندر میں ایک پہاڑی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ایک جزیرہ بن جاتا ہے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ جب انگلستان کے سوداگروں نے دیکھا کہ ڈنمارک کے سوداگر ہندوستان سے گول مرچ اور گرم مصالحے یورپ میں لاتے ہیں اور بہت نفع اٹھاتے ہیں۔ تو انہوں نے بھی ہندوستان کی تجارت کے لئے ایک کمپنی بنائی اور پھر آہستہ آہستہ ہندوستان میں ان کی تجارت ترقی کرتی گئی اور ان کا رسوخ بڑھتا گیا یہاں تک کہ انگریز ہندوستان کے بادشاہ ہو گئے۔ مگر دراصل دیکھو تو ایک بے حقیقت چیز گول مرچ حاصل کرنے کے طفیل انگریزوں کو یہ اتنی بڑی سلطنت ہندوستان کی مل گئی جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے کیسے بڑے بڑے نتیجے نکل سکتے ہیں۔

جس طرح اچھے قسم کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے بڑے بڑے اچھے نتیجے نکل سکتے ہیں اسی طرح بُرے قسم کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے بڑے بڑے بُرے نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک بچہ ایک گھر میں ذرا سی دیا سلائی رگڑ کر آگ لگا دیتا ہے کہ جس سے تمام گھر اور اس کے ساتھ تمام محلّہ اور اس کے ساتھ تمام شہر جل جاتا ہے۔ تاریخ میں مختلف ملکوں کے اس قسم کے قصے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ذرا سے واقعہ سے قوموں میں جنگ شروع ہو گئی اور خون کی ندیاں بہہ گئیں۔

ملک عرب میں قدیم زمانہ کی ایک جنگ حرب بسوس کے نام سے مشہور ہے۔ ایک شخص کا اونٹ کسی

دوسرے کے کھیت میں چلا گیا۔ کھیت والی عورت نے اونٹ کو مارا۔ اونٹ والے نے عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ اس ذرا سی بات پر ۴۹۴ء سے ۵۳۴ء تک برابر لڑائی رہی۔ یہ لڑائی عرب کے دو قبیلوں بنی بکر اور بنی تغلب میں ہونی شروع ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ تمام عرب کے قبیلے اس میں شریک ہو گئے۔ اور ابتدا سے آخر تک ستر ہزار آدمی مارے گئے۔

ایک اور اسی قسم کی لڑائی تاریخ عرب میں حرب واحس کے نام سے مشہور ہے۔ واحس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ ایک شخص نے اسے بد کا دیا۔ اتنی سی بات پر ایسا رن پڑا کہ قبیلے کے قبیلے کٹ مرے۔ اور اس جنگ کا خاتمہ تب ہوا جب بعض قبیلے اسلام لائے۔ تاریخ میں اور ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ جہاں ایک ذرا ذرا سے معاملے پر سلطنتیں بدل گئیں ہیں۔

اگر اس مضمون کے لمبا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اور بیسیوں مثالیں بیان کرتا کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے کام لگاتار کوشش اور محنت کی وجہ سے بڑے بن گئے۔ کس طرح چھوٹے چھوٹے آدمی نام ور ہو گئے۔ اور کس طرح چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کے بڑے بڑے نتیجے پیدا ہو گئے۔

اس لئے چاہیئے کہ ہم کسی چھوٹی چیز کو کبھی حقیر اور بے حقیقت نہ سمجھیں۔ پچھلے دس پندرہ برس میں خوردبین کی مدد سے ڈاکٹروں اور محقّقوں نے معلوم کیا ہے کہ مختلف متعدی وغیرہ بیماریاں بعض نہایت چھوٹے کیڑوں کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ خوفناک طاعون کا مرض جو آج کل ہندوستان میں کثرت سے پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بھی ذرا ذرا سے کیڑے ہوتے ہیں جو خون میں داخل ہو کر جھٹ آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔ پس ہر چند کہ یہ کیڑے نہایت باریک ہیں جو خوردبین کی مدد کے بغیر نظر نہیں آتے تو کیا کوئی دانشمند ان کی طرف سے بے پروائی کر سکتا ہے؟۔

ایک نوجوان کی ذرا سی غلطی کر بیٹھنے سے اس کی ساری عمر تباہ ہو جانے کا ڈر ہے۔ تو کیا وہ ذرا سی غلطی ایسی نہیں کہ جس سے اس قدر پرہیز کیا جائے کہ جتنا ڈاکو کے خنجر، سانپ کے زہر یا پھانسی کی رسی سے ہر شخص کو کرنا لازم ہے۔

جوابات شعروں میں ترکاریاں

(۱) گوبھی، (۲) آلو، (۳) سیم، (۴) باقلا، (۵) مٹر، (۶) کھیرا، (۷) شلجم (جسے شاغم بھی کہتے ہیں)، (۸) پالک، (۹) ٹنڈا، (۱۰) پیاز، (۱۱) کرم کلا، (۱۲) بھنڈی

غلام عباس طاہر

ساتھی کی تلاش

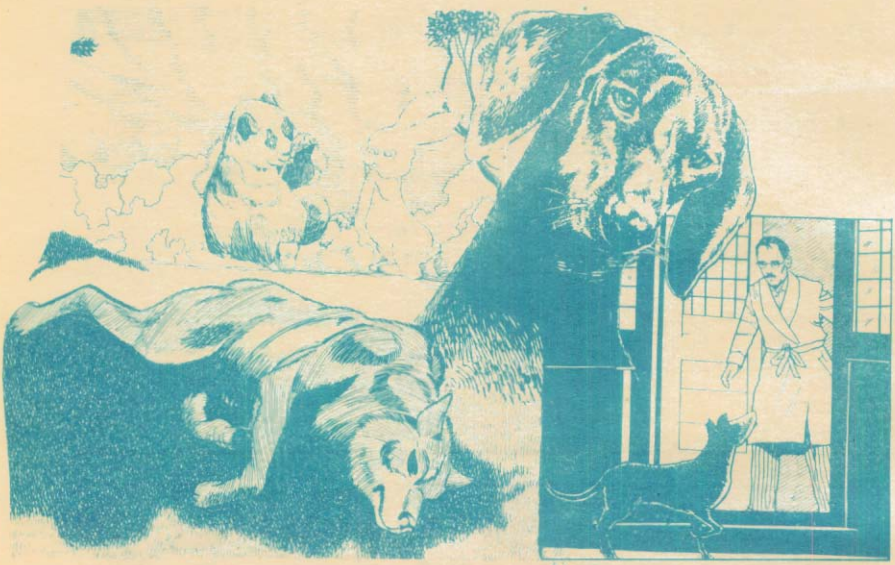

ایک کتّا ساتھی کی تلاش میں پورے جنگل میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا کچھ دیر بعد اسے خرگوش مل گیا اور اس نے کہا۔ "ارے خرگوش آؤ اکٹھے رہتے ہیں۔" "کیوں نہیں۔" خرگوش نے جواب دیا۔ تب انہوں نے جنگل میں ایک محفوظ کونہ تلاش کیا اور جب اندھیرا ہونے لگا تو وہ دونوں سونے لگے۔ خرگوش جلد سو گیا لیکن کتے کو نیند نہ آئی اور اس نے بھونکنا شروع کر دیا۔ خرگوش جاگ گیا اور کتے کو کہنے لگا "تم اس وقت کس لئے بھونک رہے ہو؟ اگر بھیڑیئے نے تمہاری آواز سن لی تو وہ ہم دونوں کو کچا چبا جائے گا۔" کتے نے دل میں سوچا میرا دوست اچھا نہیں اسکا دل تھوڑا ہے میرے خیال میں بھیڑیئے کو کسی کا ڈر نہیں اور کتے نے

خرگوش کو چھوڑا اور بھیڑیئے کو تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ اسے بھیڑیا مل گیا کتے نے بھیڑیئے سے کہا "آؤ اکٹھے رہتے ہیں۔" بھیڑیئے نے جواب دیا "ٹھیک ہے ساتھ تو دو کا ہی ہوتا ہے۔" اندھیرا چھا گیا تو وہ سونے لگے بھیڑیا جلد سو گیا اور کتا بھی مگر کتا جلد جاگ اٹھا اور بھونکنا شروع کر دیا بھیڑیئے کو کتے پر غصہ آیا اور کہا "کس لئے بھونک رہے ہو اگر ریچھ آگیا تو دونوں کو مار ڈالے گا۔" کتا سوچنے لگا "اگر یہ ریچھ سے ڈرتا ہے تو پھر ریچھ بڑا بہادر ہو گا۔" کتے نے بھیڑیئے کو چھوڑا اور ریچھ کی تلاش میں چل دیا اور جلد ہی ریچھ کو تلاش کر لیا سارا دن اکٹھے رہے جب رات ہوئی تو ریچھ اونگھنے لگا مگر آدھی رات کو کتا بھونک اٹھا، ریچھ گھبرا گیا اور کہنے لگا "چپ ہو جا اگر تمہاری آواز کسی آدمی نے سن لی تو دونوں کو مار ڈالے گا"۔ "اوہو یہ بھی بزدل نکلا۔" کتے نے سوچا تب مجھے آدمی ڈھونڈنا چاہیئے اور دور دور تک دیکھا مگر جنگل میں آدمی نظر نہ آیا۔ بالآخر جنگل سے نکل کر کنارے تک آگیا اور آرام کی خاطر بیٹھ گیا وہاں اس نے ایک آدمی کو دیکھا جو آگ جلانے کیلئے لکڑیاں اکٹھی کر رہا تھا وہ بھاگ کر اس کے پاس گیا اور کہا "اے آدمی آؤ اکٹھے رہیں۔" آدمی نے کہا "ٹھیک ہے میرے پیچھے چلے آؤ۔" آدمی اسے اپنے گھر لے گیا جب اندھیرا چھا گیا تو آدمی سو گیا اور کتے نے حسب عادت آدھی رات کو بھونکنا شروع کر دیا مگر آدمی نہ جاگا وہ اور اونچی آواز سے بھونکا جس سے آدمی جاگ گیا اس نے کتے کو روٹی ڈالی اور کہا "اگر بھوک لگی ہے تو یہ کھالو لیکن مجھے بلاوجہ مت جگاؤ۔" یہ سن کر کتا مطمئن ہو گیا اور سو گیا تب سے اب تک کتا آدمی کا ساتھی ہے اور بڑا وفادار جانور ہے۔

شین فاروقی

مچھلیاں

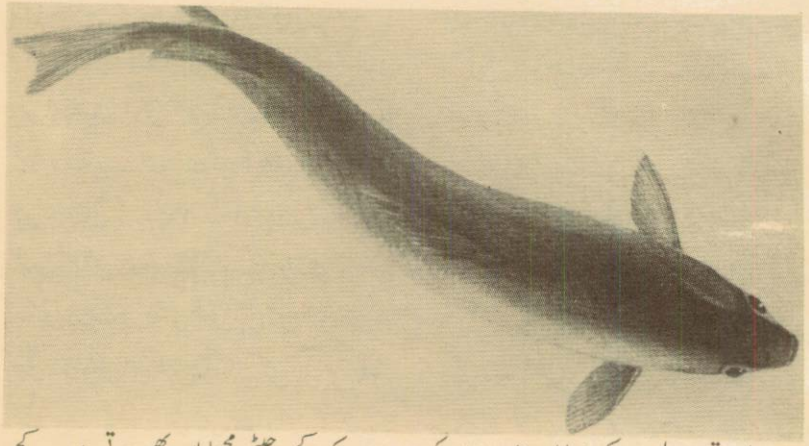

حیوانات تین طرح کے مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ زمین پر، پانی کے اندر اور ہوا میں۔ پرندے ہوا پر حکمرانی کرتے ہیں، رینگنے والے جانور زمین کے بادشاہ ہیں، جب کہ مچھلیاں پانی پر راج کرتی

ہیں۔ ان تینوں طرح کے حیوانات میں ریڑھ کی ہڈی پائی جاتی ہے، جو ان کے اجسام کو مستحکم رکھتی ہے۔ اگر ان حیوانات کے اندر ہڈیوں کا ڈھانچہ نہ ہو تو پھر یہ حیوانات سادہ حیوانات کے مقابلے پر زیادہ بڑے اور مضبوط ہو سکتے ہیں۔

قدو قامت اور شکلوں کے اعتبار سے مچھلیاں مختلف اقسام کی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی مچھلی شارک ہوتی ہے جو بیس میٹر لمبی ہو سکتی ہے۔ جب کہ سب سے چھوٹی مچھلی Gobi صرف دس سینٹی میٹر بڑی ہوتی ہے۔ مچھلیوں کی جسمانی ساخت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ ان میں کچھ گول مچھلیاں ہوتی ہیں جب کہ کچھ چپٹی مچھلیاں بھی ہوتی ہیں۔ کچھ مچھلیاں تکون کی طرح کی بھی ہوتی ہیں۔ سب سے عجیب جسمانی ساخت رکھنے والی مچھلی دراصل سمندری گھوڑا ہوتی ہے جس کا منہ گھوڑے کی طرح ہوتا ہے اور جس کے دُم بھی ہوتی ہے۔

مچھلیاں سادہ پانی میں بھی رہ سکتی ہیں اور نمکین پانی میں بھی۔ تاہم چند مچھلیوں کے سوا اکثر مچھلیاں

سمندری گھوڑا آرام کرتے ہوئے۔

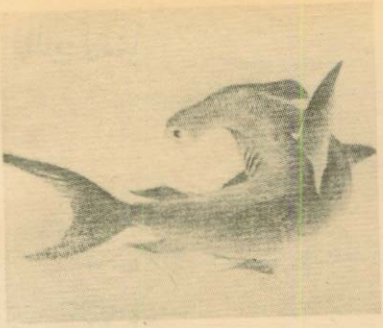

صرف ایک قسم کے پانی میں رہ سکتی ہیں۔

پانی میں رہنے والے دوسرے کئی حیوانات کی طرح مچھلیاں ڈوبتی نہیں۔ زندہ رہنے کے لئے مچھلیاں پانی کے اندر سے ہی آکسیجن حاصل کرتی ہیں۔ زمین پر رہنے والے دوسرے حیوانات کی طرح ہم بھی زندہ رہنے کے لئے ہوا سے آکسیجن حاصل کرتے ہیں جس طرح پانی میں چینی حل ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح آکسیجن بھی پانی میں گھل جاتی ہے۔ مچھلیاں پانی میں موجود اس آکسیجن کو اپنے گلپھڑوں کے ذریعہ اپنے جسم میں داخل کرتی ہیں۔ جس طرح زمین پر رہنے والے حیوانات پانی میں ڈوب جاتے ہیں اسی طرح پانی میں رہنے والی مچھلیاں ہوا میں ڈوب جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ مچھلی پانی سے نکل کر زمین پر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتی تاہم کچھ مچھلیوں کے اندر پھیپھڑے پائے جاتے ہیں جس کے باعث وہ پانی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی

شارک جو سب مچھلیوں سے زیادہ خطرناک سمجھی جاتی ہے۔

ہیں۔ ان مچھلیوں میں سے چند ایک یہ صلاحیت بھی رکھتی ہیں کہ وہ ایک تالاب سے دوسرے تالاب تک رینگتے ہوئے جا سکیں۔

مچھلیاں تیرنے کے لئے اپنے جسم کو لچکاتی ہیں اور اپنی دُم استعمال کرتی ہیں۔ کچھ مچھلیاں تیرنے کے لئے اپنے پروں کو بھی استعمال میں لاتی ہیں۔ عام طور پر مچھلیوں کے پر انہیں دائیں بائیں یا اوپر نیچے ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ جب مچھلی کو پانی میں کسی مقام پر رکنا ہوتا ہے تو وہ اپنے پروں کو حرکت دینا چھوڑ دیتی ہے۔

بہت سی مچھلیاں تنہا رہنا پسند کرتی ہیں۔ البتہ کچھ مچھلیاں گروہوں کی شکل میں رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ مچھلیوں کے ایسے گروہ میں چند ہزار سے لے کر کئی لاکھ تک مچھلیاں ہو سکتی ہیں۔ اکثر مچھلیاں ہر وقت تیرتی رہتی ہیں تاہم کچھ مچھلیاں رات کے وقت سوتی بھی ہیں۔ سوتے وقت وہ ایک جگہ

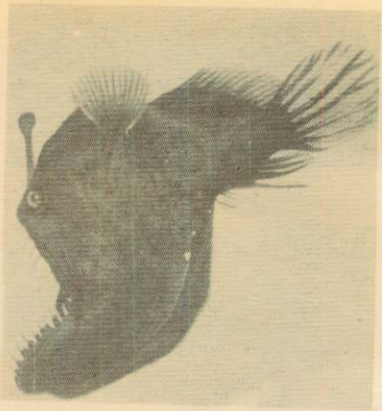

سمندر کی تہہ میں رہنے والی سیاہ مچھلی

ساکت ہو جاتی ہیں اور عام طور پر کسی جگہ چھپ کر سوتی ہیں۔

مچھلیوں کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ ان کی سونگھنے کی صلاحیت بھی بڑی عمدہ ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے مچھلیاں اپنی ان دونوں صلاحیتوں کو استعمال میں لاتی ہیں۔ مچھلیاں سن بھی سکتی ہیں۔ کبھی یہ اپنے دانتوں کو کٹکٹا کر یا اپنے پروں کو ایک دوسرے سے رگڑ کر آواز بھی پیدا کرتی ہیں۔ عام طور پر ان آوازوں کا مقصد ایک دوسرے کو کھانے پینے کی دعوت دینا یا دوسری مچھلیوں کو کسی خطرے سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔

کچھ مچھلیاں سمندر میں پائے جانے والے پودے کھاتی ہیں لیکن اکثر مچھلیاں دوسری مچھلیوں یا پانی کے دیگر حیوانات کو اپنی غذا کے طور پر کام میں

میں رنگ بدل سکتی ہوں گرگٹ کی طرح سے۔

لاتی ہیں۔ اپنے شکار کو گرفت میں لانے کے لئے مچھلیاں اپنے نوکیلے دانتوں کو عمدگی سے استعمال کرتی ہیں۔

مچھلیوں کو پانی میں رہنے سے بڑی مچھلیوں کے علاوہ کئی اور سمندری حیوانات سے خطرہ رہتا ہے۔ لیکن انہیں اپنی حفاظت کے کئی طریقے معلوم ہیں کچھ مچھلیاں تیزی سے ادھر ادھر چھپ جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں جب کہ کچھ مچھلیاں اپنے آپ کو اس طرح کا بنا لیتی ہیں کہ ان پر سمندر کی لکڑی وغیرہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ چند مچھلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں زہریلے نوک دار ریشے پائے جاتے ہیں سب سے عجیب دفاع الیکٹرک فش کا ہے جو ٦٥٠ وولٹس تک کا شاک پیدا کر سکتی ہے۔

اکثر مچھلیاں انڈوں سے پیدا ہوتی ہیں البتہ کچھ مچھلیاں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو انڈوں کے بجائے

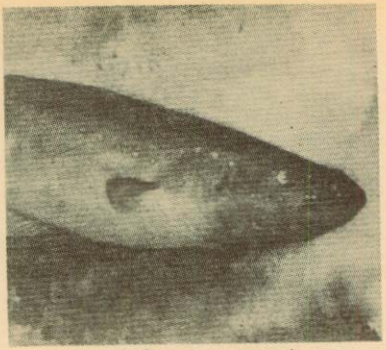

کرنٹ مارنے والی مچھلی

بچے پیدا کرتی ہیں۔
کچھ مچھلیاں بچے دینے کے لئے اپنے رہنے کی اصل جگہ سے بہت دور چلی جاتی ہیں۔ جب ان کے بچے چند دن کے ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اپنی سونگھنے کی صلاحیت کی مدد سے واپس اسی جگہ پہنچ جاتی ہیں جہاں وہ پہلے سے رہ رہی ہوتی ہیں۔

سمندر کی تہہ میں کئی عجیب و غریب مچھلیاں رہتی ہیں۔ سمندر کی گہرائی تک چونکہ روشنی نہیں پہنچ پاتی اس لئے وہاں مکمل تاریکی ہوتی ہے اس جگہ پائی جانے والی کئی مچھلیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے جسم سے روشنی خارج ہوتی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ سمندر کی اتنی گہرائی میں چونکہ غذا کا

یہ سانپ ہے یا مچھلی۔

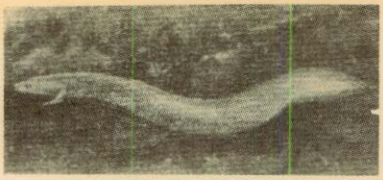

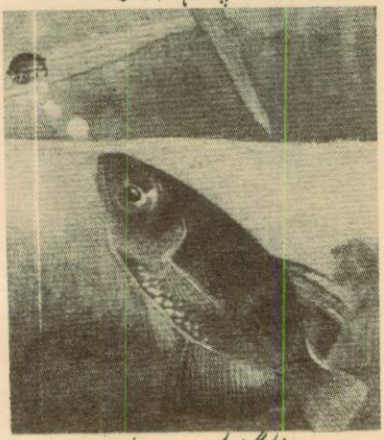

پانی کی گولی کے ذریعے شکار۔

حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اس لئے یہ مچھلیاں ایسی غذا حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو زیادہ وقت تک ان کے پیٹ میں رہ سکے۔

ان میں سے اکثر کو اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے جبڑے اور تیز دانت دیئے ہیں تاکہ یہ اپنے حجم کے حیوان کو آسانی کے ساتھ کھا سکیں۔

وصیّت

ایک کنجوس بنیئے نے مرتے وقت وصیت کی "کیونکہ میں آواگون پر یقین رکھتا ہوں کہ مرنے کے بعد انسان دوسرا جنم لیتا ہے۔ اس لئے میں اپنی تمام دولت اپنے لئے چھوڑ رہا ہوں۔"

عبدالقادر احمد۔ کراچی

روٹی کا ایک ٹکڑا

بن یامین

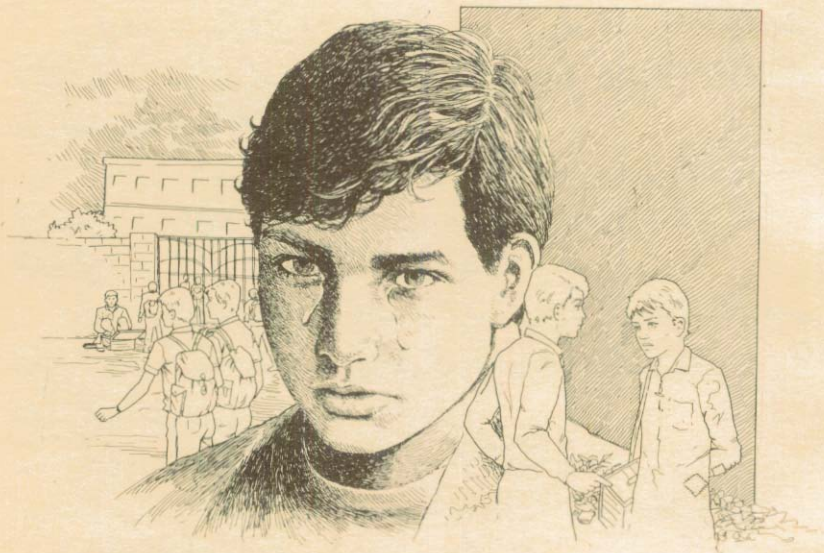

میں نے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اسکول کا چوکیدار اپنے ہاتھ میں گھنٹا اور ضرب لگانے والا ہتھوڑا لئے جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تھوڑی دیر بعد آٹھویں یعنی آخری پیریڈ کے آغاز کا اعلان ہونے والا ہے۔

ٹن..... ٹن..... ٹن۔ جیسے ہی گھنٹے نے آخری پیریڈ کے آغاز کا اعلان کیا، کلاس میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ معاشرتی علوم کے استاد نے اپنا ڈنڈا اور رجسٹر سنبھالا اور کلاس سے باہر نکل گئے۔ لڑکوں کا یہ حال تھا جیسے یہ گھنٹے کی آواز نہ ہو بلکہ "تھر" جیسے علاقے کے لئے بارش کے چھینٹے ہوں۔ یہ ہماری کلاس کا روزانہ کا معمول تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ یہ خوشی آخری پیریڈ کے آغاز کی ہوتی ہے یا معاشرتی علوم کے پیریڈ سے نجات کی یا یوں کہئے کہ معاشرتی علوم کے ڈنڈے سے نجات کی۔

آخری پیریڈ اردو کا ہوتا تھا۔ جوں توں کر کے آخری پیریڈ گزرا اور چھٹی کی گھنٹی بجنے لگی۔ جیسے ہی چھٹی کی گھنٹی بجتی لڑکے یوں نکل کر بھاگتے جیسے .... جیسے .... کوئی مناسب تشبیہ تو اس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہی مگر پتا نہیں کیوں بکریوں کا وہ ریوڑ یاد آجاتا جسے ایک دفعہ ایک آدمی ہمارے گھر کے سامنے سے لے کر گزرا تھا۔

بہر حال کوئی ان کو اس وقت دیکھتا تو یقین نہ کر پاتا کہ یہ وہی لڑکے ہیں جو صبح سویرے اسمبلی کے بعد انتہائی منظم طریقے سے کلاس میں داخل ہوتے ہیں۔

پوری کلاس خالی ہو گئی تو میں کلاس سے باہر نکلا۔ یہ میرا معمول تھا۔ اسکول کا بڑا سا میدان طے کر کے میں اسکول کے مرکزی گیٹ سے باہر آگیا۔ حسبِ توقع میرا دوست کلیم میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے لہٰذا ساتھ ہی آتے جاتے تھے۔

کلیم انتہائی "دلچسپ" قسم کا لڑکا ہے۔ وہ جس محفل میں بھی جاتا ہے اس کی جان بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس میں انتہائی کم گو ہوں۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ہم دونوں کی کیسے نبھ رہی ہے مگر یہ حقیقت تھی کہ ہم دونوں کی دوستی کی مثالیں اساتذہ بھی دیتے تھے۔

کلیم کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی متحرک مشین کا پرزہ مشین سے الگ ہو کر ہمارے درمیان آگیا ہو۔ میں نے سنا ہے کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے مگر پتا نہیں کیوں کلیم کو دیکھ کر لگتا ہے کہ کہیں نہ کہیں اس میں پارے کی آمیزش بھی ہوگی۔

نام تو پورا اس کا کلیم مغل تھا مگر ہم سب اسے کلیم شغل کہتے تھے۔

"کہاں رہ گئے تھے!" حسبِ معمول اس نے میری کمر پر بستہ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

"کہیں نہیں! میں آدمیوں کی طرح اسکول سے نکلتا ہوں۔"

"اور میں جیسے چمپنزی کی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"چھوڑو! میں اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں نے اس کی لایعنی گفتگو سے جان بچانا چاہی۔

"ہونہہ بحث کے موڈ میں نہیں ہیں۔ واہ اس بات پر بڑے موقع کا شعر یاد آیا ہے۔"

"خبردار جو مجھے شعر سنانے کی کوشش کی۔" میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کوئی ایسا شعر سنا بیٹھے گا۔ جس کا پہلا مصرعہ غالب کا ہوگا تو دوسرا فیض کا۔ یہ اس کی عادت تھی۔

پچھلی دفعہ یوم آزادی پر تقریری مقابلے ہوئے تھے تو وہ بہترین تقریر کے باوجود صرف اس وجہ سے

انعام حاصل نہ کر پایا تھا کہ آخر میں اس نے یہ شعر پڑھ دیا تھا۔

"مرے کارواں میں شامل کوئی تنگ نظر نہیں ہے
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا"

راستے بھر وہ میرا دماغ چاٹتا رہا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے مجھے الوداعی بستہ رسید کیا اور صبح آنے کا کہتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر میں داخل ہو کر میں نے یونیفارم بدلا اور سیدھا کچن میں پہنچا۔

"یہ کیا روٹیاں تو بالکل ٹھنڈی ہیں" میں با آواز بلند بولا تا کہ میری آواز امی تک پہنچ جائے۔

"بیٹا یہی کھالو۔ میں آج بہت تھک گئی ہوں" امی نے کہا۔

"میں نہیں کھاتا واتا۔" میں پیر پٹختا ہوا اوپر چلا گیا۔ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھوڑی دیر بعد میں نے قدموں کی آہٹ سنی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ میری امی ہوں گی جو میرے لئے کھانا گرم کر کے لائی ہوں گی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ حسب توقع امی کھانے کی سینی لے کر کھڑی ہوئی تھیں "لو میرے لال میں تمہارے لئے کھانا گرم کر کے لے آئی ہوں۔" میں نے تھوڑے نخرے کے بعد کھانا شروع کر دیا۔

یہ میرا اکثر کا معمول تھا۔ میں سوچتا تھا اگر کسی دن امی کھانا لے کے نہ آئیں تو کیا ہو گا؟ مگر نہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اکثر ہونے والی اس مشق سے نہ میں تھکتا تھا اور نہ امی۔

.....○.....

اگلی صبح میری آنکھ متواتر بجنے والی گھنٹی سے ہی کھلی میں اوپر ہی لیٹا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے گھر میں بھونچال آگیا ہو۔ مجھے معلوم تھا یہ کلیم ہو گا۔

میں نیچے آیا تو وہ امی کے سر پر کھڑا ہو کر انہیں جلدی ناشتہ بنانے کی ہدایت کر رہا تھا۔

"جلدی کرو تمہیں معلوم ہے سوا سات ہو چکے ہیں" مجھے دیکھتے ہی وہ چیخا۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ اتنی دیر میں امی ناشتہ تیار کر چکی تھیں ناشتہ کر کے ہم دونوں گھر سے باہر نکل آئے۔

اسکول کے گیٹ پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک میری ہی عمر کا لڑکا برش اور پالش لئے پالش کرنے بیٹھا ہے۔

میں نے اپنے گرد آلود جوتوں کی طرف دیکھا اور اسے پالش کرنے کے لئے کہا۔ جب وہ پالش کر چکا تو میں نے اپنے جیب خرچ سے دو روپے نکال کر اسے دیئے اور اسکول میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس لڑکے کو نہیں دیکھا تھا۔

واپسی پر میں نے دیکھا کہ وہ ہی لڑکا سامنے والے ٹھیلے سے نان اور چھولے لے کر کھا رہا ہے۔ میں نے برا سا منہ بنایا۔ مجھے اسطرح کھانا کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

پھر وہ لڑکا روزانہ ہی اسکول کے گیٹ پر نظر آنے لگا اور اس سے پالش کروانا میرا معمول بن گیا۔ میں روزانہ ہی اسے نان اور چھولے کھاتے دیکھتا اور بُرا سا منہ بناتا۔

اس دن اسکول جاتے وقت کلیم میرے ساتھ نہیں تھا لہٰذا میرا سارا راستہ بوریت میں گزرا۔ کلیم اپنی خالہ کے ہاں گیا ہوا تھا۔

اسکول کے گیٹ کے قریب پہنچ کر پالش کرنے والا لڑکا مجھے نظر نہ آیا وہ تین چار دنوں سے نظر نہیں آرہا تھا۔

چھٹی کے بعد میں جب باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ لڑکا برش اور پالش لئے بیٹھا ہے۔ کسی نے بھی اس سے جوتے پالش نہیں کروائے۔ ظاہر ہے کہ واپسی میں کون پالش کرواتا۔

میں اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ وہ بہت کمزور نظر آرہا تھا "کیا بات ہے تم تین چار دنوں سے نظر نہیں آرہے" میں نے اس سے پوچھا "جی ہاں، میں بیمار تھا..... جوتے پالش نہیں کروانے؟" اس نے حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں۔ اس وقت کروا کے کیا کرنا ہے۔"

یہ کہتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ کلیم کی عدم موجودگی کی وجہ سے میری رفتار خاصی سست تھی۔ ایک موڑ پر مجھے وہی پالش کرنے والا لڑکا نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کوڑے کے ڈھیر کی طرف کچھ دیکھ کر تیزی سے جھپٹا ہے۔ میں بھی تجسّس کا مارا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس نے مجھے دیکھ کر جلدی سے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف کر لئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آس پاس کے گھر سے بے خیالی میں قیمتی چیز پھینک دی گئی ہے جسے وہ چھپا رہا ہے؟

"کچھ نہیں ہے۔" وہ خوفزدہ انداز میں بولا۔

"میں کہتا ہوں دکھاؤ ورنہ ابھی لڑکوں کو آواز دے کر بلالوں گا۔" اس نے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے اور میرے اندر جیسے کچھ چھن سے ٹوٹ گیا۔ وہ آدھی کھائی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ میرے لئے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے سارے پیسے نکال کر وہیں زمین پر گرا دیئے اور بغیر یہ دیکھے کہ اس نے اٹھائے ہیں یا نہیں پوری رفتار سے بھاگتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اتنی تیز شاید میں اپنی زندگی میں نہیں دوڑا تھا۔

گھر میں پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے اور کچن میں پہنچ کر کھانا کھانے لگا تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یہ میری امی تھیں۔

"ہٹو بیٹا میں کھانا گرم کر دوں" امی نے کہا۔

"رہنے دیں امی میں کھالوں گا"۔

امی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

نمکین پانی کے دو موٹے موٹے قطرے میری آنکھوں سے نکل کر سالن کی پلیٹ میں جا گرے۔

سائن بورڈ

ایک شخص نے پینٹر کو سائن بورڈ بنانے کو کہا اور یہ عبارت لکھنے کو دی۔

"ضمیر الدین کتب فروش"

جب وہ شخص سائن بورڈ واپس لینے گیا تو اس پر یہ عبارت درج تھی۔

"کتب الدین ضمیر فروش"

(ندیم مغل ..... کراچی)

ہائیں! ہاتھی کہاں گیا؟

نئی بلّی

ایک عورت اپنی بھانجی کے لئے دوسرے ملک سے ایک بلی لائی کیوں کہ بھانجی کو جانور بہت پسند تھے۔ خالہ جب دوبارہ باہر جانے لگی تو اس نے اپنی بھانجی کو بلی کا خیال رکھنے کی سخت تاکید کی اور اپنے ملک چلی گئی۔ کچھ دنوں بعد اس عورت کو اپنی بھانجی کی یاد آئی تو اس نے فون کرنے کا ارادہ کیا فون پر اس نے اپنی بھانجی سے پوچھا "ارم بلی کا کیا حال ہے؟" بھانجی نے کہا، "وہ تو مر گئی۔" وہ عورت گرتے گرتے بچی۔

اس عورت نے اپنی بھانجی کو بتایا کہ کبھی بھی اتنی بڑی بات کو اس طرح نہیں کہتے۔ کیا پتہ سننے والا دل کا مریض ہو اور اچانک اتنی بڑی بات سننے پر اس کا دل بند ہو جائے۔ بھانجی نے پوچھا، "خالہ پھر کس طرح کہتے ہیں؟" خالہ نے کہا، "اسطرح تم کو کہنا چاہئے کہ بلی چھت پر چڑھ گئی ہے اسے اتارنے کی کوشش کی جارہی ہے آپ فکر مت کیجئے گا"۔

دوسرے دن جب میں فون کروں تو تم کو کہنا چاہئے، "خالہ بلی چھت پر سے گر پڑی ہے ہم لوگوں نے اسے جانوروں کے اسپتال بھیج دیا ہے اور آپ بے فکر رہئے گا کیوں کہ ہم اسے بچانے کی پوری پوری کوشش کریں گے"۔

تیسرے دن جب میں فون کروں تو تم کو کہنا چاہئے کہ خالہ ہم نے تو پوری کوشش کی لیکن وہ بچ نہ سکی کوئی بات نہیں جانوروں کا کیا ہے اگلے سال جب آپ دوبارہ آئیں تو دوسری بلی لے آیئے گا"۔

نصیحت کرنے کے بعد اس عورت نے اپنی امی کا پوچھا کہ ارم آپ کی نانی اماں کیسی ہیں تو اس نے کچھ اس طرح جواب دیا

"خالہ جان نانی اماں چھت پر چڑھ گئی ہیں لیکن آپ بے فکر رہئے انہیں اتارنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے ارے ارے وہ تو گر پڑیں لیکن آپ فکر مت کیجئے انہیں جانوروں کے اسپتال لے جایا جارہا ہے جہاں انہیں بچانے کی پوری کوشش کی جائے گی (تھوڑی دیر بعد) خالہ ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ نانی اماں کو بچانے کی پوری کوشش کی گئی لیکن وہ بچ نہ سکیں، کوئی بات نہیں اگلے سال جب آپ دوبارہ آیئے گا تو نئی نانی اماں لے آیئے گا۔"

حنا بشیر..... کراچی

مٹّی سے نہ کھیلئے

رضوانہ خلیق

"مٹی سے نہ کھیلو..... ! بُری بات ہے گندے بچے ہی مٹی میں کھیلتے ہیں۔"

یہ جملہ اکثر بڑوں سے سنا ہے یقیناً وہ اس لئے کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں صفائی کی بڑی اہمیت ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے ہاتھوں پر یا رخسار پر لگی ہوئی مٹی کے ساتھ ہم انہیں اچھے نہ لگتے ہوں۔ جبھی تو وہ مٹی سے کھیلنے والوں کو گندا کہتے ہیں۔

مٹی میں کھیلنے سے منع کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ وجہ "جراثیم" ہیں۔ خاص طور پر وہ جراثیم جو ہمیں بیمار کرتے ہیں جب ہم اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں مٹی لیتے ہیں تو ہمارے

دونوں ہاتھوں میں جتنی مٹی ہوتی ہے اس میں کئی کروڑ بیکٹیریا کئی لاکھ فنجائی اور کئی لاکھ الجی چھپے ہوتے ہیں۔ یہ جراثیم انسانی آنکھ سے نظر نہیں آتے بلکہ ان کو دیکھنے کے لئے خوردبین استعمال کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو خوردنامئے (Micro Organisms) کہا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تمام کے تمام ہی بیمار کرتے ہیں ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مٹی میں دبے ہوئے پودوں اور مردہ جانوروں کو تباہ و برباد کر کے مٹی کو زرخیز بناتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ واگر زائد تعداد میں ہمارے جسم میں داخل ہوجائیں تو ہمیں بیمار کرسکتے ہیں۔ پولیو (Polio) پیچش (Dysentry) تشنج (Tetanus) اور دیگر کئی بیماریاں۔

مثال کے طور پر ہمارا وہ ساتھی جو گھر سے باہر باغ تک وہیل چیئر پر جاتا ہے اور وہ دوڑ کر سرخ پھولوں سے پہلے پھولوں والی کیاری تک نہیں جاسکتا۔ وہ کسی معصوم شرارت کے بعد کسی پیڑ کے پیچھے بھی نہیں چھپ سکتا۔ یقیناً یہ پولیو کے وائرس [سمہے (Virus) کا شکار ہوگیا ہے۔ جو مٹی میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں یہ آلودہ پانی میں تو بہت زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں۔ آلودہ غذا کے استعمال سے یہ جراثیم کافی تعداد میں جسم میں داخل ہوجاتے ہیں۔ غذا کے ساتھ ساتھ یہ آنتوں میں پہنچتے ہیں اور آنتوں سے خون میں جذب ہوجاتے ہیں اور اگر جسم میں قوت مدافعت نہ ہو تو یہ خون کے ذریعے ان عصبی دھاگوں میں پہنچ جاتے ہیں جو دماغ سے جسم کے مختلف حصوں تک جاتے ہیں اور جسم کی حرکت کو کنٹرول کرتے ہیں۔ پولیو وائرس ان عصبوں کو تباہ کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ تر پیر اور کبھی کبھار ہاتھ بھی مفلوج ہوجاتے ہیں۔

اگر کبھی کھیل ہی کھیل میں ایسی چوٹ لگ جائے جس میں جسم پر خراش یا زخم آجائے تو فوراً ایسے جراثیم کش محلول مثلاً ڈیٹول سے دھونا چاہئے دوسری صورت میں یہ ممکن ہے کہ تشنج (Tetanus) کے جراثیم مٹی کے ساتھ زخم میں منتقل ہوگئے ہیں وہ اس میں زہریلے مادے (Toxins) خارج کرنا شروع کردیں یہ زہریلے مادے خون میں شامل ہو کر دماغ تک جاپہنچتے ہیں۔ دماغ پر ان کا حملہ شدید اور خوفناک ہوتا ہے اس کی وجہ سے تقریباً پورا جسم مفلوج ہوجاتا ہے اور منہ سختی سے بند ہوجاتا ہے یعنی دونوں جبڑے سختی سے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں یعنی ایک دوسرے پر جم جاتے ہیں۔ اس علامت کی وجہ سے اس بیماری کو (Lock jaw) بھی کہا جاتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ مٹی میں کھیلنے میں والے بچوں کو اگر خراش آجائے یا جسم چھل جائے اور اس پر زخم آجائے تو اس میں تشنج کے جراثیم ضرور ہی داخل ہوں زیادہ تر اس قسم کی خراشوں میں خوردنامیوں کی ایک قسم فنجائی (Fungi) داخل ہوجاتے ہیں خراش معمولی سی سوج جاتی ہے اور خوردنامئے اس جگہ پر سبزی

مائل پیلا مواد تیار کرتے ہیں اگر کسی بھی جراثیم کش (Disinfectant) مثلاً الکوحل، آیوڈین، اور ڈیٹول وغیرہ کا استعمال کیا جائے تو جلد (Skin) جلد ہی نارمل ہوجاتی ہے اور اگر جراثیم کش کا استعمال نہ کیا جائے تو یہ سوجن اور مواد (Pus) کئی مہینوں میں ختم ہوتا ہے۔

لیکن اس سے کوئی شدید بیماری پیدا نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہاں تذکرہ تو صرف دو بیماریوں کا کیا ہے لیکن ایسی بہت سی بیماریاں ہیں جن کے جراثیم مٹی میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بیماریوں کا تعلق انسانوں سے، کچھ کا جانوروں سے اور کچھ کا تعلق پودوں سے ہوتا ہے لیکن ان تمام باتوں کو مطلب یہ نہیں ہے کہ مٹی میں صرف مضر خوردنامئے ہی ہوتے ہیں۔ درحقیقت مٹی میں موجود بہت سارے خوردنامئے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے لئے بہت فائدہ مند ہوتے ہیں۔ مٹی میں پائے جانے والے پروٹوزوا (Protoza) بہت سارے بیماری پیدا کرنے والے جراثیم کو کھا جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاں پروٹوزا موجود ہوتے ہیں وہاں کوئی مرض آور خردنامیہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اور بعض اوقات تو یہ دوسرے مفید خورنامیوں کو کھا جاتے ہیں۔ بہت سے خوردنامئے ایسے بھی ہوتے ہیں جو زمین کی اندرونی تہوں میں موجود تیل اور پیٹرولیم کے بننے میں مدد دیتے ہیں مگر بہت سے خوردنامئے ان دونوں کے زیاں کا سبب بھی بنتے ہیں۔ مٹی میں پائے جانے والے فنجائی زمین کو بہت زرخیز بناتے ہیں مگر ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو پودوں میں کئی اقسام کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔

کچھ خوردنامئے ایسے ہیں جن میں کچھ خصوصیات فنجائی والی ہیں اور کچھ خصوصیات الجی کی۔ ان کو ایکٹینومائی سیز (Actinomycis) کا نام دیا گیا ہے۔ ان کی اگرچہ کئی اقسام ہیں مگر دو بہت اہم ہیں ایک وہ جو انسانوں اور جانوروں میں بیماریاں پیدا کرتے ہیں اور دوسری وہ جو کسی خاص ماحول میں ایسے مادے خارج کرتے ہیں جو بیماری پیدا کرنے والے جراثیموں کو ہلاک کر دیتے ہیں ان مادوں کو (Antibiotics) کہتے ہیں۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں تک آپہنچی ہے مگر اس قدر تفصیل پڑھ کر آپ مٹی سے خوف محسوس نہ کریں بلکہ صاف ستھرے رہیں، کیونکہ صفائی نصف ایمان ہے۔

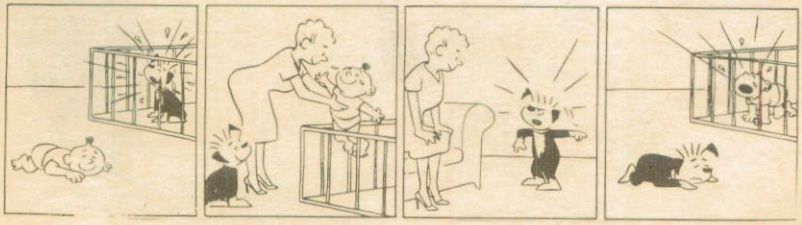

کچھ خود بھی سمجھنا چاہیئے۔

پیاس کیوں لگتی ہے؟

ذیشان بن صفدر

ہمیں پیاس کیوں لگتی ہے؛ اس کے متعلق سب سے پہلے کس نے سوچا، یہ تو معلوم نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ پیاس کیوں لگتی ہے کا جواب دینے والا پہلا سائنس دان ہیپو کریٹس تھا...... اس نے بتایا کہ جب حلق خشک ہوجاتا ہے تو ہم پیاس محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بعد تیرہویں صدی عیسوی میں ایک ترکی محقّق نے اپنے تجربات اور مسلسل غور و فکر کے بعد نتیجہ قائم کیا کہ پیاس یعنی پانی پینے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب پھیپھڑوں میں پانی کی کمی واقع ہوجاتی ہے۔ پھر زمانہ اور آگے بڑھا...... اٹھارہویں صدی کے سائنس دان مسٹر ٹین کریڈ نے بتایا کہ زبان خشک ہوجانے کی صورت میں پیاس محسوس ہوتی ہے۔ اور اب جدید طبّی تحقیقات سے ماہرین اس بات پر متفق ہوچکے ہیں کہ پیاس لگنے کا سبب ہمارے ذہن میں ایک مرکز ہے جسے تھائی پوتھو لیمس کہتے ہیں

یہ مرکز جسم میں پانی کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ایک قسم کے ہارمونز کا اخراج کرتا ہے۔ یہ ہارمونز گلے میں موجود نسوں میں پانی کا توازن اور گردوں میں پانی کے توازن کو برقرار رکھتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہم پیاس محسوس کرتے ہیں۔

اگر اس مرکزی سلسلے کو ہم دوسرے سلسلوں سے منقطع کر دیں تو پھر بغیر ضرورت ہمیں پیاس محسوس ہونے لگے گی اور اس غدود کو سرے سے ہی جسم سے نکلوا دیا جائے تو پھر ہمیں کبھی بھی پیاس محسوس نہیں ہوگی، خواہ ہمارے جسم میں پانی کی مقدار کتنی ہی کم کیوں نہ ہوجائے ..... یا جسم میں پانی کا توازن بالکل ہی بگڑ جائے۔

جسم میں پانی کے توازن کا برقرار رہنا بے حد ضروری ہے کیونکہ پانی جسم کی بہت سی ضروریات پوری کرتا ہے۔ یہ جسمانی حرارت کو برقرار رکھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔

جس قدر پانی ہمارے جسم کے لئے ضروری ہے اتنا ہی ہمارے جسم سے خارج بھی ہوتے رہنا ضروری ہے۔ ہمارے جسم سے ہر روز تقریباً پانچ سو ملی لیٹر پانی پسینے کے ذریعے، دو لیٹر پیشاب اور تین سو ملی لیٹر سانس کے عمل کے ذریعے خارج ہوجاتا ہے۔ یہ ہمارے جسم سے نقصان دہ فاسد مادے نکالتا ہے۔ اور ان کے بُرے اثرات سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔

دماغ کے اندر واقع یہ مرکزی غدود تقریباً ہر جاندار کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود انسان کے لئے۔ کیونکہ پیاس تو کیا انسان، کیا جانور حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے بھی محسوس کرتے ہیں۔ بغیر خوراک تو انسان طویل عرصے تک زندہ رہ سکتا ہے، لیکن پانی کے بغیر وہ سات دن سے زیادہ اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا۔

انسانی جسم میں اس کے وزن کا سب سے بڑا حصہ پانی میں ہوتا ہے۔ ایک اوسط قسم کے صحت مند انسانی جسم میں پینتیس سے چالیس لیٹر پانی موجود ہوتا ہے۔ ہمارے خون میں پانی کی مقدار تراسی (۸۳) فیصد نسوں میں، ستر سے پچھتر فیصد ہڈیوں میں، بیس سے پچیس فیصد رال میں، نوے فیصد پیشاب اور ننانوے فیصد پتے میں ہوتی ہے۔ جبکہ معدے میں جہاں نظام ہضم کام کرتا ہے ستانوے (۹۷) فیصد پانی ہوتا ہے۔

جسم میں سے اگر دس فیصد پانی کم ہوجائے تو بیماری اور مزید دس فیصد کمی واقع ہونے کی صورت میں موت ہو سکتی ہے۔

ہم پانی پی کر صرف اپنی تشنگی یا پیاس ہی دور نہیں کرتے بلکہ جسم کی دوسری ضروریات کے لئے بھی جسم کو پانی فراہم کرتے ہیں۔ اپنے جسم میں پانی کی مقدار صرف پانی پی کر ہی پوری نہیں کی جاتی، یہ ضرورت ہم مختلف قسم کی غذاؤں، پھلوں اور سبزیوں سے بھی پوری کرتے ہیں۔

پھلوں اور سبزیوں سے پچھتر فیصد، گوشت سے پچاس فیصد، دودھ سے ستاسی فیصد، مکھن سے پندرہ فیصد، ڈبل روٹی سے تیس فیصد پانی کی

ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔ اس طرح ایک انسانی جسم سینتالیس فیصد پانی حاصل کرتا ہے۔ جبکہ انتالیس فیصد پانی ہمیں دوسرے اقسام کے کھانوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اور چودہ (۱۴) فیصد پانی ہمارا جسم خود پیدا کرتا ہے۔

ایک صحت منداور تندرست انسان کو چار سے آٹھ لیٹر پانی اور غذاؤں کی صورت میں پانی کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ یہ مقدار اس بات پر منحصر ہے کہ انسانی جسم کا کس قدر پانی جسم سے خارج ہوتا ہے۔ زیادہ جسمانی محنت کرنے والے زیادہ پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کیونکہ محنت کرنے سے پسینے کی صورت میں زیادہ پانی کا اخراج ہوتا ہے۔ اور جسم میں پانی کی کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح موسم سرما کے مقابلے میں گرمی کے دنوں میں جسم کو زیادہ پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جسم سے نصف لیٹر پانی کی کمی واقع ہوتے ہی ہمیں پیاس کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور جیسے جیسے جسم کے اندر پانی کی کمی ہوتی رہتی ہے ، حلق، زبان اور منہ خشک ہونے لگتے ہیں۔

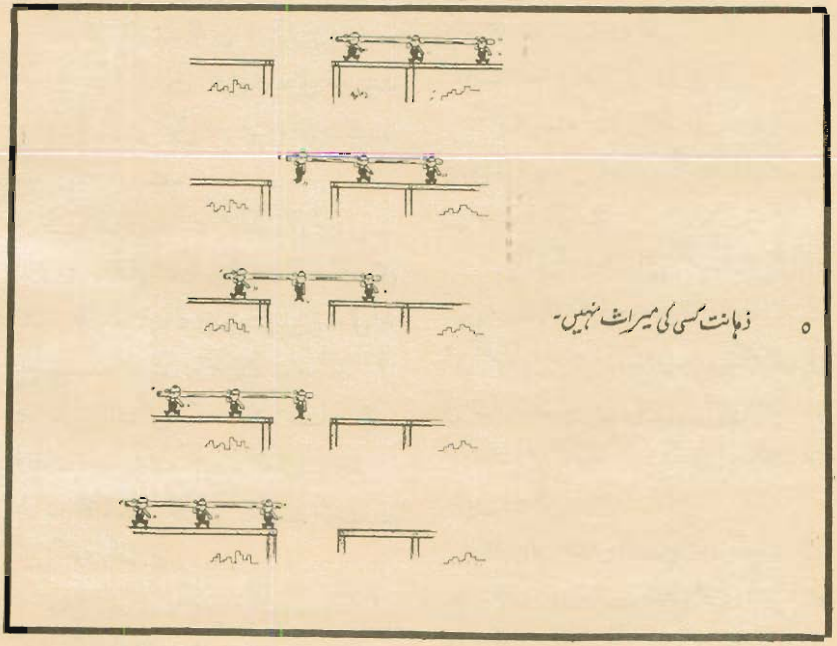

ذہانت کسی کی میراث نہیں۔

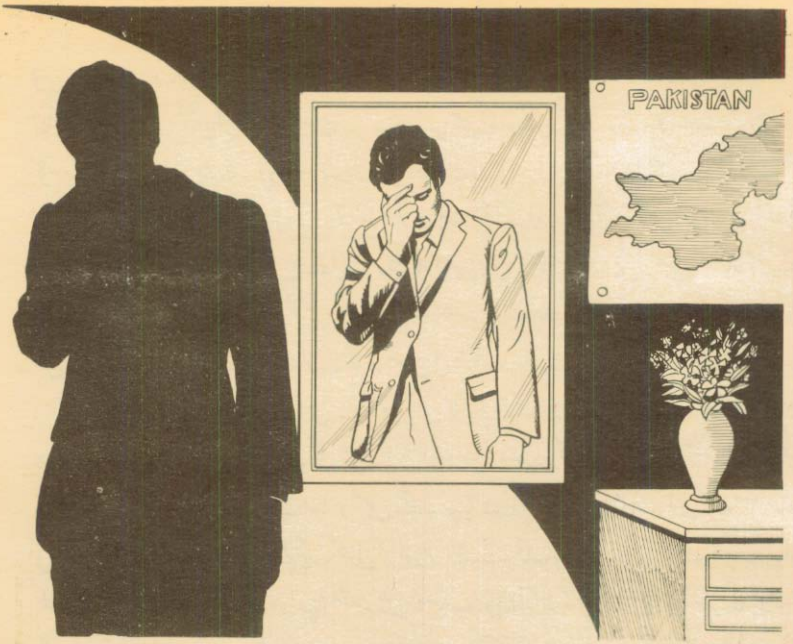

جلد باز

سیّد ذاکر حسین

نِکسن نے قد آدم آئینے میں اپنے سراپا پر نظر ڈالی اور مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ سر سے پاؤں تک چست سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ چہرے پر نقاب بھی سیاہ رنگ کا تھا جس میں آنکھوں اور ناک کی جگہ چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ پاس ہی میز پر سیاہ رنگ کا ایک بیگ پڑا تھا۔ نِکسن نے اسے اٹھایا اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے ہی وہ رک گیا..... "مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے..... جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور واپس آئینے کے سامنے آگیا۔

نِکسن ایک کامیاب چور تھا۔ قفل شکنی میں اس کی مہارت مسلّمہ تھی۔ مضبوط سے مضبوط اور

پیچیدہ سے پیچیدہ تالا بھی اس کے سامنے دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ وہ ذہین بھی تھا اور موقع شناس بھی..... لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود اس میں ایک خامی تھی..... وہ بہت جلد باز تھا۔ ہر کام چاہتا تھا کہ فوراً ہو جائے۔ اپنی اسی جلد بازی کی وجہ سے وہ کئی بار جیل کی ہوا کھا چکا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک فلیٹ میں نقب لگانے کی تیاری کر رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ جملہ کئی بار اپنے ذہن میں دہرانے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی تیاری کا جائزہ لیا۔ بیگ کھول کر تالا توڑنے کے آلات چیک کئے۔ اس علاقے کا نقشہ دیکھا جہاں وہ مطلوبہ فلیٹ تھا۔ ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے بیگ سنبھالا اور اپنے فلیٹ کو تالا لگا کر منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

مطلوبہ عمارت تک پہنچ کر اس نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ اور محتاط قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ اکثر فلیٹوں کی روشنیاں گل تھیں اور اچھا خاصا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مطلوبہ فلیٹ میں تالا لگا ہوا تھا۔ لوگ موجود نہیں تھے۔ یہ بات وہ پہلے سے جانتا تھا۔ اسی لئے اس نے آج کی رات کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے بیگ کھول کر اوزار نکالے۔ ایک بار پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور تالا کھولنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لیکن تالا کھلتے ہی خطرے کا الارم بجنا شروع ہو گیا تھا۔ نکسن ایک دم گھبرا گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس عام سے فلیٹ میں حفاظت کا جدید انتظام کیا گیا ہو گا۔ وہ ایسی کسی صورت حال سے نپٹنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ یہاں سے فوراً نکلنا چاہئے اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا تو پولیس کی ایک گشتی وین وہاں آکر رکتی ہوئی نظر آئی یقیناً انہوں نے الارم سن لیا تھا۔ دو پولیس والے اتر کر تیزی سے بلڈنگ کی طرف بھاگے۔ انہیں دیکھ کر تو نکسن بالکل ہی بد حواس ہو گیا اس نے اپنے اوزار سنبھالے اور سیڑھیوں سے اوپر کی جانب دوڑ لگا دی وہ جلد از جلد اس عمارت سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ عمارت کی چھت پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دیوار سے ملی ہوئی ایک اور بلڈنگ کی چھت تھی جو خاصی نیچی تھی۔ اس چھت پر کودنا گویا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ لیکن نکسن جیل جانے سے مرجانا بہتر سمجھتا تھا۔ اس کے گزشتہ تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ چوری کے جرم میں جیل جانے سے بہتر ہے کہ خود کشی کر لی جائے۔ جیل میں چوروں کے ساتھ جو ظالمانہ اور انسانیت سوز غیر اخلاقی سلوک کیا جاتا تھا اس کا تصور کر کے ہی نکسن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

اس نے اپنے پیچھے سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے بھاری بوٹوں کی آواز سنی جو لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ وقت کم تھا اور جو بھی فیصلہ کرنا تھا فوراً کرنا تھا۔ نکسن نے چھت پر کودنے کا فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ اس یقین تھا کہ چند سیکنڈ کے بعد اس کا جسم پختہ چھت سے ٹکرائے گا

اور اس کی کئی ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں گی۔ آنے والے تکلیف دہ لمحات کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا تو اسے احساس ہوا کہ کسی نرم وجود نے اسے تھام لیا ہے جو پہلے تو اسکے وزن سے نیچے دبتا چلا گیا اور پھر اس نے آہستہ سے نکسن کو اوپر اچھال دیا۔ وہ سخت حیران تھا۔ ایک پل کے لئے تو اس کا دماغ سن ہو کر رہ گیا اور وہ چت لیٹا خالی خالی نظروں سے فضا میں گھورتا رہا۔ جب حواس قابو میں آئے تو اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ نرم شے دراصل فوم کے ناکارہ گدّے تھے جنہیں مالک مکان نے چھت پر پھینک دیا تھا۔ قدرت کی اس مہربانی پر اس نے رب کا شکر ادا کیا اور اچھل کر ان گدوں سے نیچے اتر آیا............ بہت اوپر جہاں تھوڑی دیر پہلے نکسن موجود تھا اب پولیس کے سپاہیوں کے ہیولے نظر آرہے تھے جو نیچے جھانک جھانک کر شاید اسے تلاش کر رہے تھے وہ زیر لب مسکرایا اور ہاتھ ہلا کر انہیں ٹاٹا کیا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ اس وقت دم توڑ گئی جب اس نے ایک سپاہی کو اپنا نشانہ لے کر فائر کرتے دیکھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور پھرتی سے نیچے اترنے لگا۔ اس نے فائر کی آواز سنی لیکن گولی اسے نقصان پہنچائے بغیر کہیں اندھیرے میں گم ہو گئی۔ وہ دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا گراؤنڈ فلور تک پہنچا اور پھر جونہی اس نے سیڑھیوں کے دروازے سے باہر قدم رکھا اس کا بدن سن ہو کر رہ گیا۔ اس نے سامنے سے دو پولیس کانسٹیبلوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس نے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ اور جلد بازی میں یہ بھول گیا تھا کہ جس بلڈنگ کی چھت پر وہ کودا تھا وہ پولیس اسٹیشن کی بلڈنگ تھی۔

پطرس

ایک پادری کے نوکر کا نام پطرس تھا انہوں نے ایک دن اسے گوشت لانے کا حکم دیا اور خود گرجا گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد نوکر بھی واپس آکر گرجا گھر پہنچا اور پچھلی نشست پر بیٹھ کر پادری کا وعظ سننے لگا پادری صاحب انجیل مقدس کا سبق دے رہے تھے ایک موقعہ پر وہ بولے

"سنو بھائیو پطرس کیا کہتا ہے"

اس سے پہلے کہ وہ پطرس کا قول دہراتے ان کے نوکر نے پچھلی نشست سے آواز لگائی

"پادری صاحب ! قصائی کہتا ہے پہلے پچھلے پیسے دو پھر گوشت ملے گا"۔

رانا عاطف...... لاہور

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:- ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:- ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:- ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:- ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:- ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:- ۵۹۴۱۔
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:- ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:- ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار پشاور فون:- ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:- ۲۴۱۴
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:- ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:- ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۳، فورس روڈ، سائٹ، کراچی ۱۶

بابا کی نصیحت

محمد انوار احمد

اتنی بڑی تو ہو گئیں پھر بھی تم اے میری جان
لکھنا پڑھنا کچھ نہ جانو پڑھ نہ سکو قرآن
پڑھنے پر تو کم ہے توجہ یاد نہیں کچھ کرتیں
کھیلتی ہی رہتی ہو ہر دم کھیل ہی میں ہے دھیان
بھائی بہن ہنسیں گے تم پر کہیں گے باجی جان
پڑھتی ہو تم ہائے اب تک یسّرنا القرآن

اب بھی یاد کرو تم دل سے بنو نہ تم نادان
بھلا بُرا نہ اپنا جانو کیا تم ہو انجان
پڑھتی رہو گی کب تک آخر اُوَّ لَدَّ قتْ[1]
ختم کرو گی کب تک آخر یسّرنا القرآن
بچّے تمہارے ہنسیں گے تم پر کہیں گے امی جان
پڑھتی ہو تم ہائے اب تک یسّرنا القرآن

یاد کیا نہ دل سے تم نے، کی نہ اگر کچھ محنت
کل کو تو پھر اور بھی تم کو نہیں ملے گی فرصت
وقت اگر یہ بیت گیا تو پڑے گا پھر پچھتانا
کوئی تمہاری اس دنیا میں نہیں کرے گا عزّت
پوتے تمہارے ہنسیں گے تم پر کہیں گے دادی جان
پڑھتی ہو تم ہائے اب تک یسرنا القرآن

[1] قاعدے کا ایک سبق

پرواز سے پہلے

میں امی کو کئی بار سمجھا چکا تھا ایک بار پھر کوشش کر رہا تھا۔ ..... "امی آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ صرف جذبات سے کام مت لیں۔ دیکھئے نا ایم۔ اے کر چکا ہوں اور ابھی تک نوکری سے محروم ہوں۔ صرف پیسہ کمانا ہی میرا مقصد نہیں، یہ بھی تو سوچیں کہ یہاں کے حالات کیا ہیں۔ جب میں وہاں سیٹ ہو جاؤں گا تو آپ کو بھی بلا لوں گا۔"

"بیٹے! آخر ایک تم ہی تو نہیں ہو۔" امی گلوگیر لہجے میں بولیں۔ "تم جیسے ہزاروں نوجوان اس ملک میں رہ رہے ہیں۔ محنت کی روزی کما رہے ہیں۔ ماں باپ کی نظروں کے سامنے ہیں۔"

"امی کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ کہیں سے کوئی سنسناتی ہوئی اندھی گولی آئے اور میرا خاتمہ ہو جائے یا میں بھی کسی فرقہ وارانہ فساد کا نشانہ بن جاؤں۔" میں نے ایک ایسی دلیل دی جس کے آگے مائیں بے بس ہو جاتی ہیں۔

"موت برحق ہے بیٹے موت برحق ہے۔" وہ بہت دکھ سے بولیں اور خاموش ہو گئیں۔ امریکہ میں میرا ایک جگری دوست عارف کام کیا کرتا تھا۔ میں ملک کے حالات سے بڑا بیزار تھا۔ پر میں نے عارف کو اپنے ارادوں سے باخبر رکھا تھا اور وہ بھی میرے خیالات سے بالکل متفق تھا۔ کچھ ہی دن پہلے اس نے مجھے خوشخبری سنائی تھی کہ وہ وہاں میرے لئے ایک نوکری تلاش کر چکا ہے۔ میں خاموشی سے اپنی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ آخری مرحلہ پر امی سے اجازت طلب کرنا تھا بلکہ اپنے فیصلے سے انہیں آگاہ کرنا تھا۔ لہٰذا جب امی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تو میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابا کے انتقال کے بعد امی نے کتنی محنت مشقت سے میری پرورش کی تھی۔ لیکن آخر میں باہر صرف اپنے لئے تو نہیں جا رہا تھا۔ میں نے تو

سوچ رکھا تھا کہ وہاں جاتے ہی اور حالات قابو میں آتے ہی امی کو بلالوں گا۔

شاید امی میرا اٹل ارادہ بھانپ چکی تھیں۔ اس لئے اگلے ہی دن انہوں نے مجھے امریکہ جانے کی اجازت دے دی۔ میں اپنی خوشی میں مگن امی کے احساسات کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکا۔ ان کے آنسوؤں کو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا کہ بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمام تیاری تو پہلے ہی مکمل تھی۔ میں نے فون کر کے عارف کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی۔

روانگی کا دن آپہنچا۔ ایک طرف امریکہ جانے کی خوشی اور دوسری جانب اپنے وطن سے اپنی ماں سے دوری کا خیال دل چھیدے ڈال رہا تھا۔ امی نے بڑے حوصلے کا ثبوت دیا۔ جاتے سمے اپنی پر نگاہوں سے خدا حافظ کہا اور اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی اور دروازہ بند کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ بند دروازے کے پیچھے وہ بے تحاشا آنسو بہا رہی ہوں گی۔

میں نے ایئرپورٹ کے لئے ٹیکسی لی۔ پچھلی سیٹ پر سامان رکھا اور خود ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور تقریباً میرا ہم عمر اور کافی باتونی تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں ملک میں چھ رہا ہوں۔ وہ پوچھ بیٹھا "صاحب ملک سے باہر کیوں جا رہے ہو۔"؟

"ملک سے باہر؟" میں اپنے ہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ "اوہ ہاں! بس یہاں کے حالات کے باعث جانا پڑ رہا ہے۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"اوہ"۔ اس نے غور سے میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

گاڑی نے جونہی اگلا موڑ لیا سامنے مجمع سا دکھائی دیا۔ چند فسادی ایک بس کو گھیرے کھڑے تھے اور آگ لگا رہے تھے۔ لوگ سراسیمگی کی حالت میں یہ منظر دیکھ رہے تھے آگ لگانے والے بھی نعرے لگا رہے تھے کہ اچانک فضا تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی سے نیچے اترا۔ اور بغیر سوچے سمجھے سامنے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اس کی جرکت پر حیران رہ گیا یہ تو جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔ وہاں ایک خاتون تھیں جن کی گود میں ایک بچہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ خاتون بے حد خوفزدہ تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور بچے اور ماں پر ڈھال بن گیا۔ یکایک اس کا دایاں بازو خون سے سرخ ہونے لگا۔ اور دائیں کندھے سے نیچے کی جگہ بھی خون اگلنے لگی۔ میری تمام حسیات سو چکی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے میں ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں وہ لڑکھڑایا۔ میری تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔ ایک جھرجھری سی لے کر میں گویا ہوش میں آ گیا۔ اور دیوانہ وار اس کی جانب دوڑ پڑا۔ اسے سہارا دے کر ٹیکسی کی پچھلی نشست پر لٹایا۔ اور ان خاتون کو آگے بٹھالیا۔ یہ سب کچھ گویا میکانکی انداز میں کر رہا تھا۔ ان خاتون کی حالت بھی کچھ کم خراب نہ تھی۔ اس

ان کے محسن کا زخمی ہو جانا وہ زبان سے تو کچھ نہ بولیں مگر اس انسان دوست کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہاتی رہیں۔ میں نے خطرے کی حد سے دور انہیں اتارا۔ اور انہوں نے دعائیہ انداز میں اپنے ہاتھ بلند کر دیئے۔ یقیناً وہ اس انسان دوست کے لئے دعا کر رہی تھیں۔

میں اندھا دھند ٹیکسی بھگاتا ہوا قریبی ہسپتال پہنچا۔ اسے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ میں بے چینی سے باہر ٹہل رہا تھا۔ آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد بالآخر ڈاکٹر صاحب آپریشن تھیٹر سے نکلے۔ میں تیزی سے ان کی جانب بڑھا انہوں نے مجھے تسلی دی اور مریض کی اطمینان بخش حالت سے مجھے آگاہ کیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور جلدی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"شکریہ صاحب"۔ اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"صاحب واحب چھوڑو میرا نام راحیل ہے تمہارا نام کیا ہے؟" "جی میرا نام امین ہے۔"

"تم واقعی امین ہو، زندگی کے امین، محافظ"۔ میں نے زیر لب کہا۔

"تم نے اپنی زندگی کو خطرے میں کیوں ڈالا؟" میں نے پوچھا۔

"دو زندگیوں کو بچانے کے لئے۔" امین نے مختصراً جواب دیا۔

"لیکن تم مر بھی سکتے تھے؟"

"میں اگر نہ پہنچتا تو دو انسان مر جاتے۔ کیا یہ اچھا ہوتا؟"

میں چپ ہو گیا...... میں نے اب تک صرف کتابوں میں پڑھا تھا کہ دوسروں کے لئے جینا چاہیئے۔ آج اس کی جیتی جاگتی مثال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

میرے دل میں روشنی کی کرنیں پھوٹ پڑیں۔ میرے اندر سے آواز آئی۔ "راحیل ایک تم ہو۔ جو اپنی بوڑھی ماں کو، اپنی سرزمین کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔ کس لئے صرف اپنی ذات کے لئے۔ شرم سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میرا سر جھک گیا۔

میں کافی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر میں نے اجازت چاہی مجھے ائیرپورٹ پہنچنا تھا۔

جونہی دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھول دیا گیا۔

"آؤ میرے لعل۔" اندر سے امی کی آواز آئی۔

"بغیر دیکھے آپ نے مجھے کیسے پہچانا۔ امی"! میں نے اندر داخل ہو کر پوچھا "بھلا ایک ماں اپنے بیٹے کی چاپ کو اس کی دستک کو نہ سمجھ سکے گی۔" انہوں نے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"اب میں کہیں نہیں جاؤں گا امی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا...... اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

کہانی نگار نے نام نہیں لکھا۔

ترجمہ: محمد شاہد

نرالا چور

"واقعی یہ ایک عجیب معاملہ ہے!"

میں نے خلاؤں میں گھور کر سوچتے ہوئے کہا..... میرے سامنے میز کی طرف "ارشیاء" کا سب بڑا زمیندار بیٹھا ہوا تھا۔

ارشیاء ایک بڑا گاؤں تھا جس میں سبھی مکانات کچے تھے۔ صرف اس زمیندار کا مکان پکا تھا۔ جس نے مجھے اپنا نام شوگی بتایا تھا۔

شوگی کے چہرے پر الجھنوں کے بہت واضح آثار تھے۔ وہ بار بار ہونٹوں کو بھینچ رہا تھا۔ اور بے چینی سے پینسل اپنے ہاتھوں میں گھما رہا تھا۔

"مجھے بھوت پریت پر کبھی یقین نہیں تھا....." اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "مگر بہت جلد مجھے اپنا خیال تبدیل کرنا پڑا..... اس پراسرار چور کو پکڑنا واقعی بہت مشکل ہے۔ کم از کم میرے لئے..... تاہم میری آخری امید..... آپ لوگوں سے وابستہ ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی اور کہا..... "آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ واقعی کوئی اور مخلوق ہے۔ تاہم ہم بغیر کچھ کئے آپ کو کامیابی یا ناکامی کی سند نہیں دے سکتے..... آپ تسلی رکھیں..... میں اور ہومز کل

آپ تک پہنچ جائیں گے۔"

"بہت شکریہ!" وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا..... "میں بہت بے چینی سے آپ لوگوں کا انتظار کروں گا.....!!!"

میں نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ اور پھر وہ چلا گیا۔

ہومز کو میں نے تمام گفتگو سے آگاہ کیا جو میرے اور شوگی کے درمیان ہوئی تھی۔

"شوگی نے چور پکڑنے کی بہت کوشش کی..... مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا!" میں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی..... پہلے پہل چوری ہفتہ میں ایک بار ہو جایا کرتی تھی۔ مگر اب یہ سلسلہ اس قدر چل نکلا ہے کہ ہفتہ میں بمشکل کوئی ایسا دن شوگی کو میسر آتا ہے جس دن اس کی کوئی چیز غائب ہونے سے بچ جائے..... اس نے پولیس کو اپنے گھر کے گرد پھیلا دیا..... رات بھر وہ کڑی نگاہوں سے ارد گرد کی نگرانی کرتے رہے۔ مگر صبح ہوتے ہی انسپکٹر کو خبر ملی کہ اس کا ایک چاندی کا بھاری بھر کم جگ غائب ہو چکا ہے....."

"ہوں.....!" ہومز نے ہنکار بھرا۔ پھر وہ چونک کر بولا..... "یہ بھی تو ممکن ہے کہ پولیس چور کے ساتھ.....!"

"زمیندار سے میں نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔" ہومز کی بات کاٹ کر میں نے جواب دیا..... "اس نے اپنے آدمیوں سے بھی پہرہ دلوایا..... ہومز نے آنکھیں بند کر کے پیٹھ کرسی سے ٹکا دی۔ وہ چند ثانیے سوچوں کی عمیق گہرائیوں میں کھویا رہا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولا..... "ہم یہاں بیٹھ کر قیاس آرائیاں نہیں کر سکتے..... ہمیں کل صبح ہی روانہ ہو جانا چاہئے....."

ہمارے درمیان چند مزید باتیں ہوئیں..... اور بالآخر ہومز لمبے لمبے قدم اٹھاتا دفتر سے باہر نکل آیا۔

اگلے دن دو گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ شوگی ہمیں بہت پرتپاک انداز میں ملا۔ اس نے ہمارے لئے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ ہم نے نہا کر سفر کی تکان دور کی۔ اور پھر کھانا کھا کر آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔

شام کے وقت تازہ دم ہو کر ہم سیر کے لئے نکل گئے۔ شوگی ہمارے ساتھ جانے پر بضد تھا مگر ہومز

نے اسے یہ کہہ کر کہ "یہ بھی ہمارے کیس کا ایک حصہ ہے!" مایوس کر دیا۔

شوگی کی حویلی سے کافی دور نکل جانے کے بعد ہم نے ایک دیہاتی کو روکا۔ چند باتوں کے بعد میں نے اس سے شوگی کے متعلق سوال کیا۔

"بہت اچھا انسان ہے......!" اس نے آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم یہاں چور پکڑنے آئے ہیں...... ایسا چور...... جس کی شہرت بہت دور تک تک پھیلی ہوئی ہے...... اور ممکن ہے کل وہ چور زمیندار کے گھر کے بعد تمہارے گھر کا رخ کرے۔" میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ "تم لوگوں کو ہماری مدد کرنی چاہئے!!!"

مگر اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے بعد جواب دیا...... "ہم لوگوں کے پاس ہے ہی کیا جو چور لے جائے گا۔"

"دیکھو دوست...... ہومز نے پہلی مرتبہ مداخلت کی......" تم ہم پر ارد گرد کی حقیقت واضح کرو۔ ایسا پہلے کبھی ہوا تھا......"

"نہیں!"

"گویا یہ پہلی مرتبہ ہے!"

"جی ہاں!"

"یہاں کے لوگ کیسے ہیں، میرا مطلب ہے ان میں چور اچکا......؟"

"نہیں...... یہاں سب غریب اور امن پسند لوگ رہتے ہیں، سوائے زمیندار کے آدمیوں کے...... یہ میں نے کیا کہہ دیا!"

اچانک وہ بدحواس ہو کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔

اس کی حالت سے ہمیں اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ یہ لوگ شوگی سے بہت خوفزدہ ہیں۔ گویا وہ ایک ظالم اور سنگدل شخص ہے۔ جیسے عام زمیندار ہوتے ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی اور اور بہت سی باتیں ہم نے شوگی کے متعلق جان لیں کہ وہ کسی قماش کا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی باتیں بھی ہمیں معلوم ہوئیں جن کا پہلے ہمیں علم نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ شوگی عام زمیندار کی طرح لوگوں کی پیداوار ناجائز طور پر حاصل کرتا ہے۔ انہیں اندھا دھند پیٹتا ہے۔ اس کی بیوی بیس سال پہلے مر گئی تھی۔ اور اب

شمیکب ہی اس کا واحد سہارا ہے۔ شمیکب کے متعلق ہمیں کئی لوگوں نے بتایا کہ وہ ایک اچھا انسان ہے۔ دیانتدار ملنسار..... اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب اسی گاؤں میں آگیا تھا۔ یہاں وہ باپ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا تھا۔ گاؤں میں ایک اسکول کھولنے پر بضد تھا۔ اور غریبوں کی بھی مدد کرتا تھا۔ وہ بہت کم باہر نکلتا۔ اس کا زیادہ تر وقت اس کی ننھی سی لائبریری میں گزرتا۔ جہاں بعض اوقات وہ سو بھی جایا کرتا تھا۔ ہم گھر کے ملازمین سے ملے۔ مگر ہمیں مایوسی ہوئی۔ ملازمین بہت سادہ سے لوگ تھے۔ جو مکر و فریب اور دھوکہ کرنا نہیں جانتے تھے۔ اور شمیکب کو ہم نے ہر لحاظ سے ایک ملنسار شخص پایا۔

تاہم تجربے کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ہم ان پر اندھا دھند اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ شوگی کو بھی شمیکب سے والہانہ لگاؤ اور محبت تھی۔ وہی تو اس کی کُل کائنات تھا۔ اس کا بے حساب جائداد کا وارث۔

تاہم سب سے پہلے تو ہومز کے کہنے پر ہم نے رات کو اردگرد کی نگرانی کی۔ ہومز چھت پر بیٹھ گیا اور بہت چوکنے انداز میں اردگرد دیکھتا رہا۔ جب کہ میں صحن میں بیٹھا رہا۔ گھر کی بتیاں بھی جلتی رہیں۔ رات ہم نے بہت چوکس ہو کر گزاری۔ صبح ہومز چھت سے نیچے اتر آیا۔ اور میرے کندھے کو دبا کر بولا.....

"دیکھا واٹسن آج چور نہیں آیا.....!" "چور اپنا کام کر کے جا بھی چکا ہے۔ مسٹر ہومز!" ہم آواز کی جانب گھومے وہاں شوگی کھڑا طنز بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمیں ہمراہ آنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے کی طرف مڑ گیا۔

کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی مگر میز پر رکھا پیتل کا مجسمہ غائب تھا۔

قالین پر قدموں کے نشانات بھی نہیں تھے۔ ہومز کے چہرے پر الجھن تیر گئی۔ واقعی ہمیں حیرت ہونی چاہئے، ہماری نظریں ایک لمحے کے لئے بھی بے خبر نہیں ہوئیں تھیں۔ پھر چوری کیسے ہو گئی؟ یہ تھا سوال جو ہمیں پریشان کر رہا تھا۔

"اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ چور..... گھر میں ہے۔!" ہومز نے پختہ لہجے میں جواب دیا۔

ہم نے ہر داؤ آزمایا..... سوالات کی اندھا دھند بوچھاڑ کی۔ مگر مجسمہ کہیں نہ ملا۔ ہم نے ہر جگہ

چھان ماری..... مگر لگتا تھا جیسے اسے زمین نے نگل لیا ہے۔

"بہت خوب!" ہومز نے مسکرا کر شوگی سے کہا۔ "آپ کا چور تو ہمیں زبردستی..... بھوت پریت کے نظریات منوانے پر تلا ہوا ہے.....!" ہومز کی بات پر میں نے کھل کر ایک قہقہہ لگایا۔

"واٹسن.....!" ہومز نے سنجیدگی سے کہا..... "ہمیں یہاں سے فوراً روانہ ہو جانا چاہئے۔!!! مجھے یہ جگہ آسیب زدہ لگتی ہے۔!!"

"گویا..... آپ.....!" میں نے حیرت سے کہنا چاہا۔

"ہاں بات کچھ ایسی ہے!" میری بات اس نے کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس پراسرار چوری سے بھوت پریت کے تصور کی تصدیق ہو جاتی ہے..... سوری..... مسٹر شوگی! ہم اس سلسلہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتے!!!"

اتنی جلدی ہمیں ہارتا دیکھ کر شوگی حیرت زدہ رہ گیا۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا..... "مجھے بہت پہلے خدشہ تھا..... تاہم آپ لوگوں سے بھی شکایت نہیں کی سکتی ہے۔"

"ہم سرِ شام ہی چلے جائیں گے۔" اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ہومز نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہومز کی اس بات سے میں حیرت زدہ رہ گیا۔ تاہم میں نے فی الحال بولنا مناسب نہ سمجھا..... شام کو جب ہم روانہ ہونے لگے تو شوگی نے چہرے پر خفیف مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے بہت جلد ہار مان لی۔ مسٹر ہومز!!"

"میں جلدی فیصلے کرنے کا عادی ہوں..... تاہم میں ہر فیصلہ کرنے سے پہلے سوچتا ضرور ہوں۔ میں خواہ مخواہ یہاں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے پتا ہے کہ میں چور کو نہیں پکڑ سکتا!"

اس سے رخصت ہونے کے بعد ہم پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ جھاڑیوں اور اونچی نیچی زمین پر ہم چلے جا رہے تھے۔ میرے اندر ہومز کے اس ردِ عمل پر بہت سے سوال مچل رہے تھے۔ مگر میں خاموش رہنے کی کوشش کرتا رہا۔

رات کا اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ حویلی سے کافی فاصلے تک آنے کے بعد ہومز رک گیا۔

"کیا ہوا؟"

"واپس چلو!!!" اس نے زمین پر سامان رکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟"

"حویلی...... ہم چھپ کر چور پکڑنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے۔ شوگی خود چور ہو......!
ہم اسے یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ہم جا چکے ہیں۔!!!"

میں نے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود سرہلایا اور واپس ہو لیا۔ قریب پہنچ کر ہم نے سامان ایک جھاڑی میں چھپایا...... اور...... پھر...... دیواریں پھلانگ کر اندر چلے گئے۔ رات کی تاریکی کسی حد تک غالب آچکی تھی!!!

تم چوری چھپے...... شیکاب کے کمرے میں داخل ہو جاؤ۔ صبح سویرے نکل جانا۔ میں شوگی کے کمرے میں رہوں گا۔ اس عیار شخص سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔

میں نے کسی وفادار بچے کی طرح سرہلایا...... اور ہم چھپ کر اپنے اپنے کمروں میں داخل ہو کر نگرانی کرنے لگے۔ میں پردوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مگر شیکاب بے خبر ہو کر سویا ہوا تھا۔ جانے رات کا کونسا پہر تھا۔ میں غنودگی کی حالت میں کھڑا بار بار سر کو جھٹک کر نیند بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک غیر معمولی بات ہوئی۔ ہلکی سی آواز سن کر میں چوکنا ہو گیا۔ نیند کوسوں دور چلی گئی......!

چھت سے ہلکی آواز آرہی تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا...... ایک سفید دھاگہ ایک مڑی ہوئی سیخ میں گھس رہا تھا۔ دھاگے کا ایک سرا قالین تک چلا گیا تھا۔ جبکہ دوسرا سرا غیر معمولی طور پر...... شیکاب کے بالوں سے بندھا ہوا تھا...... دھاگے کے چند ہلکے جھٹکوں کے بعد شیکاب بیدار ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر آنکھیں صاف کیں...... دھاگے کو بالوں سے توڑ کر ہلکا سا جوابی جھٹکا دیا...... اور دھاگہ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا...... میں فاتحانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا...... میری رگوں میں مسرتیں رقص کرتی پھر رہی تھیں۔ شاید چور کا پراسرار معاملہ حل ہو رہا تھا۔ شیکاب نے چوکنے انداز میں سر کو جھٹکا۔ اور اٹھ کر ایک نزدیکی دروازہ کھول کر دوسری طرف چلا گیا۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ اسی کمرے میں کھلتا تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے اس کے پیچھے جانا چاہئے یا نہیں...... پھر فوراً ایک خیال کے

تحت میں تیزی سے پردے کے پیچھے سے نکلا اور اس دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا..... دونوں کمرے تیز روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ جس سے مجھے بے انتہا الجھنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ دروازے میں سے میں نے جھانک کر دیکھا..... شیکب دوسری طرف سے ہاتھ میں کچھ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ وہ کافی نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اور مجھے اس مختصر سے وقفے میں بہت کچھ کرنا تھا۔ اس کی نظروں سے آنے سے تمام معاملہ چوپٹ ہو جاتا۔ تاہم میں نے تیزی سے چھلانگ لگائی اور پلنگ کے پیچھے ہو گیا۔ میرے قدموں کی خفیف آہٹیں اس تک نہ پہنچ سکیں۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سے صندوقچی تھی۔ اس نے دوسرے کمرے کی روشنی بجھائی..... اور پھر کونے میں سے قالین ہٹایا تو ایک ڈھکنا واضح نظر آنے لگا۔ جس کی سطح فرش کے ہموار تھی۔ اس نے ڈھکنا کھولا اور آرام سے قدم اٹھاتا ہوا اندر چلا گیا۔

شیکب کا یہ روپ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا..... "کیا یہ وہی ملنسار غریبوں کا خیر خواہ شیکب ہے.....؟؟"

میں حیرت زدہ انداز میں سوچتا رہ گیا۔

اس کے اندر جاتے ہی میں نے تیزی سے جست لگائی..... اور ہومز کو بلایا..... دہانہ دیکھ کر ہومز کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

صبح جب شیکب ہتھکڑیاں پہنے انسپکٹر کے ساتھ جا رہا تھا۔ تو نہ جانے مجھے اس کے چہرے پر ایک ناقابل تسخیر عظمت کیوں نظر آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے چوری نہیں کی۔

"میں ایک بات تم سے پوچھنا چاہوں تو.....؟" ہومز نے پوچھا۔

"جی..... فرمایئے!!!"

"مجھے معلوم ہے۔ تم آسانی سے اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتاؤ گے تاہم کیا میں یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ تم یہ دولت کدھر لے جاتے تھے۔ سرنگ میں تو کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک طویل سرنگ ہے جس کا ایک دہانہ تمہارے کمرے میں ہے اور دوسرا باہر ایک ویران مکان میں..... پھر یہ دولت.....؟"

"مسٹر ہومز..... اور واٹسن!" اس نے ہم دونوں کو سنجیدگی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جب آپ نے یہ پتا چلا لیا کہ میں غریبوں کی مدد کرتا ہوں تو آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ میں اتنی رقم کہاں

سے حاصل کرتا تھا۔ کیا آپ کا خیال تھا کہ مجھے میرے والدیہ رقم دیتے ہیں؟ اگر یہ سوچ تھی تو آپ غلطی پر تھے..... وہ تو صرف لوٹ کھسوٹ کے عادی ہیں..... مگر میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا، میں اتنا ظلم نہیں دیکھ سکتا..... میں جارہا ہوں..... جانے کتنی مدت کے لئے..... تاہم "ارشیاء" ایک نئے شیکسپ کی راہ تکے گا!!!" اس نے سر جھٹک کر ایک حقارت آمیز نظر باپ پر ڈالی اور انسپکٹر سے مخاطب ہو کر بولا..... "چلو انسپکٹر میں بھی ایک عرصہ سے مظلوموں کی آہوں اور ظالموں کے جبر..... کے دونوں پاٹوں میں پس رہا تھا۔..... مجھے سکون اور آرام کی اشد ضرورت تھی!"

انسپکٹر چل پڑا..... شوگی سسکیاں بھر رہا تھا۔ میں نے شوگی کی جانب دیکھا..... ہومز نے درشت لہجے میں کہا۔ "آپ بہت چھوٹے ہیں مسٹر شوگی.....! اب بھی وقت ہے..... آپ کا بیٹا مجرم نہیں.....!!! وہ اب بھی معصوم ہے!!!" اس نے کربناک نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر جاتے ہوئے انسپکٹر کی طرف مڑ کر چلایا..... رک جاؤ انسپکٹر..... رک جاؤ..... میں ہار گیا ہوں..... رک جاؤ..... رک جاؤ شیکسپ!!!"

میں نے اطمینان بھری نظروں سے ہومز کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔! آسمان کی رفعتوں پر چمکتا ہوا صبح کا تارا..... اس کی آنکھ میں کانپتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

پاگل خانے کے ایک مریض کا معائنہ کرنے کے دوران ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد کیا کرے گا۔

مریض نے بتایا کہ وہ کہیں سے جوتے حاصل کرے گا اور پاگل خانے واپس آکر سارے ڈاکٹروں اور عملے کے جوتے لگائے گا۔

مریض کا چھ ماہ تک علاج مزید کرایا گیا۔ اس سے پھر یہ سوال کیا گیا "مریض نے جواب دیا میں یہاں سے جاکر نوکری تلاش کروں گا۔ ایک مکان کرائے پر لوں گا اس کے بعد شادی کروں گا۔

"شاباش" ڈاکٹر نے خوش ہو کر کہا "یہ بڑی اچھی بات ہے"۔

مریض نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا' شادی کے بعد میں اپنی بیوی کو مکان میں لے جاؤں گا اور اس کے جوتے چرا کر یہاں بھاگ آؤں گا۔ تاکہ تم لوگوں کو وہ جوتے لگاؤں۔

اسماء رحمٰن خان۔ کریم آباد کراچی نمبر ۳۵

جھلمل کرتے ستارے

ساجد سید

اسکول کی سردیوں کی چھٹیوں کو ہوئے ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ اس دوران سلمان میاں نے اپنے ماموں جان کے گھر کا رخ کیا۔ یہ ان کا معمول تھا کہ وہ چھٹیوں کے دوران ماموں جان کے گھر چلے جاتے تھے جو ایک مقامی کالج میں پروفیسر تھے۔ سلمان کے ماموں کھلے ذہن کے آدمی تھے اور ان کے ذہن میں مختلف موضوعات پر معلومات کا ذخیرہ جمع رہتا تھا۔ اس کی وجہ ان کا گہرا مطالعہ تھا۔ آج بھی وہ سلمان میاں کو ہمیشہ کی طرح کچھ بتانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سلمان میاں اپنے ماموں جان کے اسٹڈی روم میں جا بیٹھے۔ ماموں جان کسی کتاب کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔

"ماموں جان! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے کسی دن اس وسیع و عریض کائنات کے

بارے میں بتائیں گے۔"

ماموں جان نے بڑے پیار بھرے انداز میں سلمان میاں کی طرف دیکھا اور زیر مطالعہ کتاب کو ایک طرف رکھ کر اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

سلمان میاں، ہماری کائنات کی وسعت کا اندازہ آج تک کوئی سائنس دان نہیں لگا سکا۔ خلا کی تسخیر انسان کی ہمیشہ سب سے بڑی خواہش رہی ہے۔ جب انسان نے ہوش بھی نہ سنبھالا تھا تو اس وقت بھی اسے کائنات کے بارے میں جاننے کی جستجو تھی۔ اور انسان کی اس جستجو کو دوربین (Telesscope) نے کافی حد تک تقویت دی۔ یہ کائنات اپنے اندر لاکھوں کی تعداد میں کہکشائیں سموئے ہوئے ہے اور ایک کہکشاں میں لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں ستارے موجود ہیں جن میں ایک ہمارا سورج بھی ہے۔

اللہ کی اس وسیع کائنات کا مشاہدہ کرنے والے کو سائنس کی زبان میں ماہر فلکیات کہا جاتا ہے۔ ستاروں کا علم جاننا ایک مقبول مشغلہ ہے۔ سینکڑوں بچے، جوان اور بوڑھے رات کو آسمان پر جگمگاتے اور جھلمل کرتے ستاروں کو دوربینوں کی مدد سے دیکھ کر اپنے شوق کی تکمیل کرتے ہیں۔

ستاروں کا علم جاننا سائنس کی ایک پرانی شاخ ہے۔ اب سے کوئی پانچ ہزار سال پہلے ماہر فلکیات اپنے مشاہدات سے ستاروں کے بارے میں علم رکھتے تھے۔ قدیم یونانی دوربینوں کے بغیر ایک مخصوص کیلنڈر بنا کر ستاروں کی گردش معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہی لوگوں نے تقریباً دو ہزار سال پہلے ستاروں کے نقشے بنائے۔ اور اسی قوم میں سے ایک آدمی پٹالمی نے اس موضوع پر پہلی کتاب لکھی۔ اس کا نظریہ تھا کہ ہماری زمین کائنات کے درمیان میں ہے اور تمام اجرام فلکی اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اس نظریہ کو ۱۵۴۳ء میں مشہور ماہر فلکیات نیکولس کوپر نیکس نے اپنے مشاہدے سے مسترد کر دیا اس کے خیال کے مطابق زمین اور دیگر دوسرے سیارے ہمارے سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اس نظریہ کو آگے جا کر بہت سے سائنس دانوں نے اپنے مشاہدے سے ٹھیک قرار دیا۔

سب سے پہلے سادہ دوربین (Simple Telescope) ۱۶۰۰ء میں دنیا میں متعارف ہوئی۔ مشہور اٹالین ماہر فلکیات گیلیلو نے کوپر نیکس کے اس خیال کو درست قرار دیا کہ سورج کے گرد ہماری زمین اور دوسرے سیارے گردش کر رہے ہیں یہ اس نے ابتدائی دوربین کی مدد سے بتایا۔

"ماموں جان، موجودہ سائنس دان اب کس طرح ستاروں کے بارے میں علم رکھتے ہیں؟" سلمان نے پوچھا۔

"سلمان میاں، موجودہ علم فلکیات بہت ترقی کر چکا ہے آج ماہرین فلکیات دیو قامت عمارتوں میں دوربین نصب کر کے رات کی تاریکی میں آسمان پر موجود کروڑوں سیاروں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کے لئے ان کے پاس جدید کیمرے موجود رہتے ہیں جو مختلف سیاروں اور ستاروں کی موقع پر تصویریں لیتے ہیں۔

آج کی موجودہ سائنس فلکیات کے بارے میں جو معلومات حاصل کر رہی ہے۔اس میں استعمال ہونے والے اوزاروں میں ڈش لائیک ریڈیو (dish like radio) شامل ہے۔اس سے ستاروں سے باہر نکلنے والی ریڈیائی لہروں کے بارے میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔جب سے (Space age) خلائی پروگراموں پر کام شروع ہوا ہے اس وقت سے ماہرین فلکیات کیمروں اور دوربینوں کو خلا میں بھیجنے لگے ہیں یہ مخصوص آلات خلا میں جاکر چاند اور دیگر سیاروں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی ان تحقیقات کو بہت کم عرصے میں زمین پر بھیجتے ہیں۔

سلمان میاں، آپ نے رات کی تاریکی میں جھلملاتے ستارے تو دیکھیں ہوں گے یہ خطہ زمین سے کروڑوں میل دور ہیں۔ان میں ہمارا سورج بھی ہے جو تقریباً ایک سو پچاس لاکھ کلو میٹر دور ہے۔ کچھ ستارے دیکھنے میں چمکدار اور قریب معلوم ہوتے ہیں دراصل یہ بڑے ستارے ہوتے ہیں۔ "ماموں جان ہم ان ستاروں کی پیمائش کس طرح کر سکتے ہیں؟"

آپ کائنات کے مختلف ستاروں کے فاصلوں کی باآسانی پیمائش نوری سال سے کر سکتے ہیں۔ روشنی کے ایک سال کا اندازہ روشنی کے ایک سال کے سفر سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہماری دنیا سے قریب ترین ستارے کا نام سورج ہے یہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ روشنی اس ستارے سے ہم تک تقریباً ۳ : ۴ سالوں میں پہنچتی ہے۔ اس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سورج ہم سے ۳ : ۴ نوری سال دور ہے۔

ہمارے سورج کی اوسط جسامت ایک طرف سے دوسری طرف تک تقریباً چودہ لاکھ کلو میٹر ہے۔ لیکن بعض ستارے سورج سے کئی گناہ زیادہ بڑے ہیں اور ان کی جسامت کروڑوں کلو میٹر پر محیط ہوتی ہے اس کے علاوہ کچھ ستارے (White dwarys) کہلاتے ہیں جو کہ ہمارے سورج سے بہت چھوٹے ہیں۔

"ماموں جان، کیا یہ ستارے ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے ہیں؟"

سلمان میاں، آسمان پر ان چمکتے اور جھلمل کرتے ستاروں کے گروپ ہوتے ہیں اور اس گروپ کو (مجمع النجم) یا(Consytellation) کہا جاتا ہے۔ آپ ان ستاروں کو ملا ہوا دیکھیں گے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ بعض وقت ایک دوسرے سے سیکڑوں نوری سال دور ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں تو ایک دوسرے کے قریب معلوم ہوتے ہیں کیونکہ یہ ایک دوسرے کے پیچھے ہوتے ہیں بعض ستارے خلا میں تنہا سفر کرتے ہیں بعض گروپ کی شکل میں۔

اگر ہم اپنی کھلی آنکھوں سے یعنی قریب سے ان ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھیں تو یہ خلا میں گردش کرتی نظر آئیں گے اور یہ دودھیا رنگ (Milkyway) کے ستاروں کے گروپ ہماری کہکشاں ہے۔ ہماری کہکشاں تقریباً ایک طرف سے دوسری طرف تک ایک لاکھ (۱۰۰،۰۰۰) نوری سال کے برابر ہے اور اس میں تقریباً ایک لاکھ ستارے موجود ہیں۔ ہماری کہکشاں کی بناوٹ پیچدار(Spivalshape) ..... کی سی ہے۔ جبکہ دیگر دوسری کہکشائیں بیضوی (Oval) اور بعض کی کوئی خاص شکل نہیں ہے۔ یہ کہہ کر ماموں جان نے اپنی بات ختم کی۔ سلمان میاں یہ سب کچھ سننے کے بعد کچھ گم سم سے تھے، اچانک بول پڑے۔

"تو ماموں جان اتنی بڑی کائنات میں ہماری کیا اہمیت۔"

"بیٹا! ویسے دیکھنے میں تو ہم کچھ بھی نہیں۔ لیکن اپنی ذہنی صلاحیت اور قابلیت کی وجہ سے ہمیں اللہ نے اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ اور ہم میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ ہم کوشش کریں تو ستاروں اور سیاروں کو بھی تسخیر کر سکتے ہیں۔

شریف آدمی

مالک مکان (کرایہ دار سے) "میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔"
کرایہ دار "اور میں بھی آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔"
مالک مکان "آپ ٹھیک سمجھے میں غلطی پر تھا۔"

شکیل احمد بابر...... راولپنڈی

نئے لکھنے والوں کی مختصر تحریروں کا مستقل سلسلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

نعت رسول مقبولؐ

صاعقہ ناصر مانو۔ فیصل آباد

مہ و مہر سر کو جھکانے لگے
بساطِ مسرّت بچھانے لگا
سرِ راہ پلکیں بچھانے لگے
سب آپس کی نفرت مٹانے لگے
حبیبِ خدا مسکرانے لگے
حبیب خدا مسکرانے لگے
اجالا فضاؤں پہ چھانے لگا
جو باطل تھا نابود ہو جائے گا
اندھیرا زمانے سے جانے لگا
زمانے سے مفقود ہو جائے گا
مسرت کے سب گیت گانے لگے
سرشتِ وفا سب دکھانے لگے
حبیبِ خدا مسکرانے لگے
حبیب خدا مسکرانے لگے
رہائی بشر غم سے پانے لگا

بابا لال دین کی ورزش

عبدالحمید گلشن کرمپوری

ہمارے گاؤں کی انوکھی شخصیت بابا لال دین کو اچانک پچاس برس کی عمر میں ورزش کرنے کا شوق چرایا۔ لوگوں نے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانے ایک روز صبح کے وقت وہ دودھ کا گلاس لے کر بڑ کے درخت کے نیچے جا پہنچے اور لگے ورزش کرنے۔ ان کی ورزش کا سلسلہ ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ ان کے دشمنوں کا کہنا ہے کہ یہ سلسلہ چھ برس بھی جاری رہ سکتا تھا اگر ایک واقعہ نہ ہو جاتا۔

وہ ان کی ورزش کا ساتواں دن تھا۔ بابا حسب معمول بڑ کے درخت کے نیچے پہنچے۔ دودھ کے گلاس کو ٹوپی سے ڈھک کر ایک طرف رکھا اور لگے عجیب و غریب حرکتیں کرنے بار بار اپنی ان ہی حرکتوں کو ورزش کہتے تھے۔ گاؤں کے بہت سے فارغ لوگ بابا کی ورزش کا منظر چھپ کر دیکھتے اور خوب لطف اٹھاتے بابا اپنی ورزش کا آغاز بالوں سے بے نیاز کھوپڑی پر دونوں ہاتھوں سے زور زور سے تھپڑ مار کر ہوا میں زور سے فلائنگ کک چلانے کی ناکام کوشش کے ذریعہ کرتے

اس کے بعد وہ مرغا بن کر بڑے زور زور سے ککڑوں کوں ...... ککڑوں کوں۔ کی آوازیں نکالتے ہوئے مینڈک کی طرح پھدکنے لگتے تھے۔

تیسرے نمبر پر وہ پنجوں کے بل اچھلتے ہوئے اپنے غار جیسے منہ سے ایسی عجیب و غریب آوازیں نکالتے تھے۔ جیسے چھوٹے چھوٹے بچے دودھ پینے کے لئے رو رہے ہوں۔ پھر وہ ایک ٹانگ کے بل چلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بار بار منہ کے بل گر جاتے تھے مگر تھے وہ بڑے ہمت والے پانچ چھ منٹ بعد ہانپتے کانپتے لڑکھڑاتے پھڑپھڑاتے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ کھڑے ہو کر چند منٹ وہ اپنی سانسوں پر قابو پاتے ...... پھر اپنے بڑھاپے پر اپنی گزری ہوئی جوانی کو دوبارہ غالب کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگ جاتے۔

اس روز یوں ہوا کہ جب بابا لال دین نے معمول کے مطابق مرغے والی ورزش کرتے ہوئے روزانہ کی طرح ککڑوں کوں۔ کی آوازیں نکالیں۔ تو اچانک بڑ کے درخت پر جو کوئے کائیں کائیں کی زبردست فائرنگ

کرتے ہوئے بابالال دین کی بالوں سے محروم بے چاری گنجی کھوپڑی پر حملہ آور ہوئے۔ ادھر کوؤں نے ان کی کھوپڑی پر فضائی حملہ کیا۔ ادھر ان کو ایک زبردست قسم کی چھینک آئی۔ اور وہ گھبرا کر ایک دم اچھل پڑے۔ جب کوؤں نے کائیں کائیں کا جنگی سائرن بجاتے ہوئے ان کی گنجی کھوپڑی پر دوبارہ ہوائی حملہ کیا۔ تو وہ اس بری طرح سے گھبرا گئے کہ اپنا دودھ کا بھرا ہوا گلاس اور اپنی ٹوپی اس درخت کے نیچے چھوڑ چھاڑ کر اپنی کھوپڑی کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر وہاں سے چیختے چلاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے دونوں گوے بھی کائیں کائیں کی آوازوں کی گولیاں برساتے شور مچاتے اڑے چلے جا رہے تھے۔ کوؤں کو اپنے تعاقب میں آتا دیکھ کر بابالال دین کے رہے سہے اوسان بھی جواب دے گئے۔ بوکھلاہٹ میں انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہو گئے ہیں۔ جس کے در و دیوار اور خاص طور پر دروازہ گرنے کے لئے معمولی سے اشارہ کا منتظر تھا بابا جیسے ہی دروازے سے ٹکرائے وہ دھڑام کی آواز کے ساتھ نیچے آیا۔ مگر یہ بابالال دین کی خوش قسمتی تھی۔ کہ وہ دروازہ گرنے سے صرف چند سیکنڈ پہلے دروازے سے گزر کر مکان میں داخل ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

بابا لال دین جب تیزی سے مکان میں داخل ہوئے۔ تو بوکھلاہٹ میں اپنے راستے میں کھڑی کسی چیز سے ٹکرائے وہ گرنے ہی والے تھے کہ ان کے کانوں کے قریب خوفناک ڈراؤنی سی آواز بلند ہوئی .....

ڈھینچوں ..... ڈھینچوں..... ڈھینچوں .....

کچھ تو بابالال دین کے ہوش وہ حواس کوؤں نے تعاقب کر کے چھین لئے تھے رہی سہی کسر اس مکان میں گونجنے والی اس بے ہنگم سی خوفناک آواز نے پوری کر دی۔ آواز سنتے ہی بابالال دین کچھ سوچے سمجھے بغیر مارے دہشت وخوف کے وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

ہم کئی لوگ جو بابا کی ورزشوں کا چھپ کر نظارہ کر رہے تھے۔ بابالال دین کے پیچھے پیچھے اس کچے مکان میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک آوارہ گدھا بابا لال دین کے پاس کھڑا ہوا منہ اوپر اٹھائے اپنی بے ہنگم سی آواز میں ڈھینچوں ڈھینچوں کی ہوائی گولہ باری کر رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی ہماری ہنسی ہمارے قابو سے باہر ہو گئی۔

ہم نے پہلے تو گدھے کو وہاں سے بھگایا۔ اور پھر بابا لال دین کو بمشکل ہوش میں لائے۔ ہوش میں آتے ہی انہوں نے سہم کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ ہم نے انہیں تسلی دی۔ جب بابالال دین کو معلوم ہوا۔ کہ وہ جس آواز کو خوف کے عالم میں کسی چڑیل یا جن بھوت کی آواز سمجھ بیٹھے تھے وہ گدھے کی تھی۔ تو وہ بڑے شرمندہ ہوئے۔

اس دن کے بعد پورے گاؤں نے کوشش کی کہ بابا اپنی ورزش دوبارہ شروع کر دیں مگر بابا راضی نہ ہوئے۔ ممکن ہے بابا خوف زدہ ہوں یا شرمندہ ہوں۔ ہاں اس واقعہ کے بعد بابا کی ورزش ہمارے گاؤں سے نکل کر دور دراز کے گاؤں تک پہنچ گئی۔ شاید اس لئے کسی نے کہا ہر کام میں بھی کوئی نہ کوئی فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ مگر فائدے کے چکر میں آپ بھی ایسی حرکت نہ کر بیٹھئے گا۔ واضح رہے کہ ہم نتائج کے ذمہ دار نہ ہوں گے!

ماں

ا...... ماں سے ہمدردی کی توقع رکھنے کی بجائے ماں کا ہمدرد ہونا چاہئے۔

(ارسطو)

۲...... ماں کا پیار ایسا ہے جو کسی کے سیکھنے اور کسی کو بتانے کا نہیں۔

(حکیم لقمان)

۳...... ماں کی محبت حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

(حالی)

۴...... ماں اور پھول میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

(نادر شاہ)

۵...... آسمان کا آخری اور بہترین تحفہ ماں ہے۔

(ملٹن)

۶...... میری ہر تکلیف اور غم میں میری ماں کا تصور ہی میرے لئے نجات بن جاتا ہے۔

(ابوالفضل)

۷...... سخت سے سخت دل کو ماں کی پر نم آنکھوں سے موم کیا جاسکتا ہے۔

(علامہ اقبال)

۸...... دنیا کی سب سے حسین شے ماں اور صرف ماں ہے۔

(مولانا محمد علی جوہر)

جہاں نما

ا۔ وہ کونسا ملک ہے جس کے نام کو لکھنے کے لئے نہ ہمیں نقطہ لگانہ پڑے گا اور نہ قلم اٹھانا پڑے گا جیسے (علی)؟

۲۔ مینڈکوں کی سب سے بڑی قسم کا نام کیا ہے؟

۳۔ مولانا شبلی نعمانی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۴۔ مگرمچھ انڈے دیتا ہے یا بچے؟

۵۔ دل کے کتنے خانے ہوتے ہیں؟

۶۔ خواجہ الطاف حسین حالی کب پیدا ہوئے؟

۷۔ میر تقی میر کا انتقال کب ہوا؟

۸۔ پاکستان کی جانب سے اپنے پہلے میچ کی پہلے اوور کی پہلی گیند پر وکٹ کس نے حاصل کی تھی؟

۹۔ دنیا میں سب سے زیادہ لوہا کہاں پایا جاتا ہے؟

۱۰۔ مسلم لیگ نے حکومت پنجاب کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کب پیش کی تھی؟

۱۱۔ کس کرکٹر نے انٹرنیشنل کرکٹ آف دی ایئر کا اعزاز تین مرتبہ حاصل کیا؟

۱۲۔ بابائے اردو کسے کہا جاتا ہے؟

۱۳۔ کوہ قاف کہاں واقع ہے؟

۱۴۔ پہلا مصنوعی سیارہ کس سن میں ایجاد ہوا؟

۱۵۔ حضرت عائشہؓ کی والدہ کا نام کیا تھا؟

۱۶۔ مکی ماؤس کے موجد کا نام بتائیں؟

۱۷۔ اڑنے والے سانپ کہاں پائے جاتے ہیں؟

۱۸۔ دنیا میں سب سے بڑی عمارت کونسی ہے؟

۱۹۔ وہ کونسا واحد ملک ہے جہاں کوئی سینما گھر نہیں؟

جوابات

(۱) مصر (۲) گولائتھ (۳) ۱۸۵۷ اعظم گڑھ (۴) انڈے (۵) ۴ (چار) (۶) ۱۸۳۷ (۷) ۱۸۱۰ (۸) انتخاب عالم (۹) برازیل (۱۰) ۱۹۴۶ء (۱۱) ویوین رچرڈ (۱۲) مولوی

عبدالحق (۱۳) روس (۱۴) ۱۹۵۷ (۱۵) ام رومان (۱۶) والٹ ڈزنی (۱۷) جاوا۔ ملائیشیا (۱۸) امپائر اسٹیٹ (امریکہ) (۱۹) سعودی عرب۔

سید وسیم مراد شاہ

۲۱ ویں صدی

خبر حدیثوں میں جس کی آئی
وہی زمانہ اب آرہا ہے
زمین تیور بدل رہی ہے
فلک بھی آنکھیں دکھا رہا ہے
بنا ہے بھائی بھائی کا دشمن
بہن کو بھائی ستا رہا ہے
کرے گناہ اور کمال سمجھے
حرام کو بھی حلال سمجھے
پرایا مال اپنا مال سمجھے
یہ آج دنیا میں ہو رہا ہے
امیر کی دیکھو سینہ زوری
غریب کا دل دکھا رہا ہے
خبر حدیثوں میں جس کی آئی
وہی زمانہ اب آرہا ہے

عبدالقیوم فتح محمد قریشی

حیدر آباد

"لوئی پاسچر"

سید توصیف علی (ملتان)

اس کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے دیوانے کتے کے کاٹے کا علاج دریافت کیا۔ اس ایجاد کی دریافت سے قبل دیوانے کتے کی آواز علاقے میں خوف و دہشت پھیلا دیتی تھی۔

لوئی پاسچر ایک چمڑا رنگنے والے کا بیٹا تھا۔ ۲۷ دسمبر ۱۸۲۲ء کو ڈولے کے مقام پر پیدا ہوا۔ اور ۱۸۴۷ء میں پیرس کے "ایکولے فراملے" سے گریجویٹ ہو کر نکلا۔ پہلے دیجون میں طبیعات کا پروفیسر مقرر ہوا۔ پھر سٹراس بورگ میں کیمسٹری پڑھاتا رہا۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ بیئر سے بعض "بیماریاں" پیدا ہو جاتی تھیں جن کے اسباب سے دنیا واقف نہ تھی۔ پاسچر ان کو معلوم کرنے میں مصروف ہو گیا، دوستوں نے بہتری حوصلہ شکنی کی، لیکن وہ برابر کام میں لگا رہا۔ اور آخر اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ بعض نظر نہ آنے والے کیڑے تخمیر میں پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۷۲ء میں اس نے تخمیر پر اپنا مشہور مقالہ شائع کیا۔ جس کے بعد بیئر اور شراب بنانا اندھا دھند عمل نہ رہا، بلکہ سائنس کے اصولوں کے ماتحت آگیا۔

۱۸۶۰ء میں جنوبی فرانس کی ریشم کی صنعت ریشم کے کیڑوں میں بیماری پھیل جانے کی وجہ سے خطرے میں پڑ گئی تو پاسچر نے اپنے دوست ڈوماس کی درخواست پر اس کا سبب بھی معلوم کر لیا۔ یہ بعض جراثیم تھے جن کے قائم کے لئے دوا تجویز کر دی گئی اس طرح ریشم کی صنعت تباہی سے بچ گئی۔ پاسچر نے حیوانات کی ایک خطرناک بیماری "بھیڑ تپ" اور مرغیوں کے ہیضے کا ٹیکہ بھی

دریافت کیا تھا۔ پاسچر نے پہلے پہلے دیوانے کتے کے کاٹے کا علاج کتوں پر ہی آزمایا۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں ایک انسان پر بھی آزمایا۔ تین سال بعد پیرس میں "پاسچر انسٹیٹیوٹ" قائم کیا گیا اور پھر دنیا بھر میں ایسے ادارے کھولے گئے۔ جن کا نتیجہ یہ ہے کہ اب دیوانے کتے کے مریضوں کی شرح اموات ایک فیصد سے بھی کم رہ گئی ہے۔

۲۸ ستمبر ۱۸۹۰ء میں سینٹ کلاؤڈ کے مقام پر پاسچر کا انتقال ہو گیا۔

"بدلہ"

محمد کاشف۔ کراچی

کمال اپنی والدہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا تھا۔ اس کے والد ایک ٹرین کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس شدید صدمے سے کمال کی والدہ بستر سے لگ گئیں تھیں۔ کمال کے پاس ان کے علاج اور ادویات کے لئے پیسے نہ تھے۔

کمال کا ایک نیک سیرت دوست عمران اس کی ماں کی دن رات خدمت کرتا تھا۔ کمال کا ایک یہی بہترین اور پر خلوص دوست تھا۔ عمران کے کہنے پر کمال نے نوکری تلاش کرنا شروع کر دی۔ پھر ایک روز اسے نوکری مل ہی گئی۔

عمران نے یہ بات نوٹ کی کہ جب سے کمال نے نوکری کی ہے اس کی صحت مسلسل گر رہی ہے۔ اس نے کمال سے اس بارے میں پوچھا بھی مگر وہ بات کو ٹال گیا۔

ایک روز عمران سودا لینے کے لئے بڑے بازار اپنی سائیکل پر روانہ ہوا بڑا بازار خاصے فاصلے پر تھا راستے میں کھیتوں کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے تھے عمران ان مناظر میں گم چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر کمال پر پڑی اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا۔ اور وہ اس کی جانب ہی آ رہا تھا۔ لیکن اس کی نظر عمران پر نہیں پڑی تھی عمران کو اس کی حرکتیں مشکوک لگیں۔ اس نے سائیکل کو تیزی سے کھیتوں میں چھپایا اور خود درخت کے اوپر چڑھ کر پتوں میں چھپ گیا۔

کمال تیزی سے چلتا ہوا اسی درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا جہاں عمران چھپا ہوا تھا کمال بار بار بے چینی سے گھڑی دیکھنے لگا۔

تقریباً دس منٹ بعد سامنے والی جھاڑیوں سے ایک آدمی نکلا عمران اس کو دیکھ کر چونک گیا۔ کیوں کہ وہ یہاں کا بہت بڑا غنڈہ تھا۔

وہ آدمی تیزی سے چلتا ہوا کمال کے پاس آیا اور بولا۔

"مال نکالو"

"یار اس کو بڑی مشکل سے اس کو نکال کر لایا ہوں" کمال نے تھیلے میں سے ایک پڑیا نکالی اور باقی تھیلا اس کے حوالے کر دیا۔

عمران کو پکا یقین تھا کہ کمال نشے کو پورے ملک میں

پھیلا رہا ہے اور خود بھی نشے کی لت میں پڑ گیا ہے۔

شام کو عمران کمال کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمال حسب معمول سگریٹ نوشی میں مصروف تھا۔ عمران نے کمال کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینکتے ہوئے کہا "تم جس عادت میں پڑے ہو وہ بہت بڑی ہے۔ نشا انسان کے لئے دونوں جہاں میں رسوائی کا سبب ہے تم اس عادت کو ترک کر دو۔"

عمران کے اتنے کہنے کے باوجود کمال پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

عمران نے کافی سوچ بچار کے بعد کمال سے متعلق تمام باتیں پولیس کو بتا دیں۔ پولیس نے کمال کو گرفتار کر لیا۔ کمال کو چار سال کی سزا ہو گئی۔

کمال نے پانچ مہینے جیل میں بڑی مشکل سے کاٹے جب تک جیل میں رہا اس کے دل میں عمران کے لئے ایک نفرت سی پکتی رہی اس کے ذہن میں عمران کو قتل کرنے کا پروگرام تھا اور وہ اپنی ماں کی طرف سے بھی بہت فکر مند تھا۔ اس کو ماں کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔

ایک دن کمال جیل سے فرار ہو کر اپنی بستی کے کھیتوں میں چھپ گیا۔ جیل کی وردی اتار کر رات کی تاریکی میں اپنے گھر کی دیوار کود کر گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت اس کی ماں سوئی ہوئی تھی گھر میں کافی قیمتی ساز و سامان کا اضافہ ہوا تھا۔ اچانک اس کی نظر ان خطوط پر پڑی جو میز پر رکھے تھے۔ کمال خط اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"میری پیاری اماں میں آپ کی اجازت کے بغیر شارجہ نوکری کے سلسلے میں جا رہا ہوں امید ہے کہ آپ مجھے اس غلطی پر معاف کر دیں گی۔ میں اپنی تنخواہ سے دو ہزار روپے گھر کے خرچ کے لئے بھیج رہا ہو۔"

فقط آپ کا بیٹا کمال

کمال سوچ رہا تھا کہ یہ خط کس نے تحریر کیا ہے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا۔ پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں عمران کا خیال بجلی کی طرح کوندا اور وہ ایسے گھر سے نکل کر عمران کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دیوار پھلانگ کر وہ عمران کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ عمران اپنے بستر پر سو رہا تھا اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔ عمران کو دیکھتے ہی کمال کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا اس کے چہرے پر غصے کے اثرات ابھر آئے اس نے آگے بڑھ کر عمران کے گلے پر مضبوطی سے ہاتھ جما دیئے چند لمحوں بعد عمران اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ عمران کو ختم کرنے کے بعد وہ واپس مڑنے لگا تو اس کی نظر میز پر پڑے کاغذ پڑی وہ کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"اماں میں آپ کی دعاؤں سے ٹھیک ہوں۔ دوسری تنخواہ سے ڈھائی ہزار روپے آپ کو بھیج رہا ہوں۔

فقط آپکا بیٹا کمال

دوسرے دن اخبار میں بہت سی خبروں کے ساتھ یہ خبر بھی شائع ہوئی "ایک مفرور قیدی کمال نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر دریا کے پل سے کود کر خودکشی کر لی۔"

اسلامی معلومات

مرسلہ۔ شبنم ثقلین ۔ کراچی

(۱)..... راہ اسلام میں شہید ہونے والے پہلے مرد حضرت حارث بن ابی حالہؓ تھے۔

(۲)..... راہ اسلام میں شہید ہونے والی پہلی خاتون حضرت سمیعہؓ تھیں۔

(۳) ...... پہلا حج ۹ ہجری کو ہوا۔

(۴) ...... غزوہ احد میں سب سے پہلے مسلمان خواتین پہنچیں۔

(۵) ...... احد وہ پہاڑ ہے جس میں حضرت حمزہؓ اور دوسرے ۶۹ صحابہ کرام شہید ہوئے تھے۔

(۶) ...... قرآن شریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر سب سے زیادہ آیا ہے۔

(۷) ...... پہلی عیدالضحیٰ ۱۰ ذی الحجہ ۲ ہجری کو منائی گئی۔

(۸) ...... پہلی عید الفطر یکم شوال ۲ ہجری کو منائی گئی۔

(۹) ...... روزے ۲ ہجری میں فرض ہوئے۔

(۱۰) ...... سب سے پہلا جمعہ ۱۲ ربیع الاول ۱ ہجری کو پڑھایا گیا۔

اقوال زرّیں

مرسلہ ...... عظیم شمیم کراچی

۱ ...... علم لازوال دولت ہے (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

۲ ...... ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ (حضرت امام حسنؓ)

۳ ...... ایمان دار تاجر کا مرتبہ عابد کے مرتبے کے برابر ہوتا ہے۔ (حضرت امام شافعی)

۴ ...... انسانی خدمت میں عظمت ہے۔ (حضرت امام رازیؒ)

۵ ...... دل کا سکون چاہتے ہو تو حسد سے دور رہو۔ (حضرت بابا فرید گنج بخش شکر)

۶ ...... حلال روزی کمانے والے کے دل کو خدا نور سے بھر دیتا ہے۔ (شاہ عبداللطیف بھٹائی)

آسٹریلیا کے قصبوں کے دلچسپ نام

مرسلہ ...... محمد ظفران کراچی

آسٹریلیا میں قصبوں کے بڑے دلچسپ نام مثلاً "TURN TURN" - "N0" - "GO" - "O" - "K" (KEEP IT) اور (YO YO) وغیرہ وغیرہ۔

انبیاء کرام کی عمریں

حضرت آدمؑ	۱۰۰۰ سال
حضرت نوحؑ	۹۵۰ سال
حضرت شعیبؑ	۹۹۲ سال
حضرت ادریسؑ	۳۵۶ سال
حضرت ہودؑ	۲۶۵ سال
حضرت ابراہیمؑ	۱۹۵ سال
حضرت اسماعیلؑ	۱۳۷ سال
حضرت یعقوبؑ	۱۲۷ سال
حضرت موسیٰؑ	۱۲۵ سال
حضرت اسحاقؑ	۱۲۰ سال
حضرت یوسفؑ	۱۰۰ سال
حضرت محمدؐ	۶۳ سال

مرسلہ :۔ سید اسد محمود، لاہور

اپنی نگارشات صاف خوشخط کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں

نقل شدہ، طویل اور غیر معیاری تحریریں شائع نہ ہو سکیں گی

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں

گمشدہ بچہ

محمد انجم مبین، ڈیرہ اسماعیل خان

مچھیروں کی بستی میں ایک مچھیرا رامو بھی اپنی بیوی اور ایک لڑکے کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ رامو بہت لالچی قسم کا آدمی تھا اور اس کی نظر ہر ایک کی دولت پر لگی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے لڑکے حامد کو بھی اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ جب، کہ حامد بے چارے نے بہت کوشش کی کہ وہ تعلیم حاصل کرے۔ لیکن باپ نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اس کا خیال تھا کہ پڑھنے سے خواہ مخواہ کا خرچ ہو گا۔

ایک دن رامو مچھیرے کی طبیعت کچھ خراب تھی چنانچہ اس نے حامد کو اکیلا کام پر بھیج دیا۔ ماں نے کہا بھی کہ ابھی بچہ ہے۔ اور نا تجربہ کار ہے۔ لیکن رامو مچھیرا بولا "ارے نیک بخت جب کام کرے گا تب ہی تو تجربہ بھی حاصل ہو گا۔ یا گھر بیٹھے بیٹھے ہی یہ تجربہ کار بن جائے گا۔ اور اگر یہ مچھلیاں پکڑنے نہیں جائے گا تو ہم کیا کھائیں گے۔ تیرا سر۔"

حامد بے چارہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے کافی دور نکل گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ جس کی وجہ سے پانی کافی چڑھا ہوا تھا اور طغیانی آئی ہوئی تھی۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا حامد کی کشتی ایک بھنور میں پھنس گئی حامد نے کافی کوشش کی لیکن کشتی ڈوب گئی حامد کا دماغ چکرانے لگا اور اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب حامد کو کافی دیر ہو گئی اور وہ گھر نہ لوٹا تو اس کی ماں کو فکر ہوئی۔ مچھیرا رامو اسے تلاش کرنے نکلا تو چند مچھیروں نے اسے بتایا کہ "تمہارے بیٹے کی کشتی بھنور میں پھنس گئی تھی۔ ہم نے دور سے اسے دیکھا تھا لیکن ہم اس کی مدد نہ کر سکے کیونکہ وہ بہت آگے نکل گیا

تھا۔

دونوں میاں بیوی کو بیٹے کی موت پر بڑا دکھ ہوا اور وہ رو دھو کر بیٹھ گئے اور وقت کے ساتھ ساتھ جلد کو بھولتے چلے گئے۔

سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی رات کو جب رامو حقہ پی رہا تھا اور اس کی بیوی سو رہی تھی تو ان کے دروازے پر دستک ہوئی مچھیرا رامو بے وقت دروازہ کھٹکنے پر غصہ سے بڑبڑا اٹھا اور دروازہ کھول دیا سامنے ایک بائیس تئیس سال کا نوجوان کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا "بابا کیا میں ایک رات کے لئے یہاں ٹھہر سکتا ہوں مسافر ہوں اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" رامو مچھیرے نے کچھ سوچتے ہوئے اسے اجازت دے دی۔ اور بریف کیس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے چھوٹے سے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور کچھ ہی دیر بعد اس کمرے سے نوجوان کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔

رامو نے للچائی نظروں سے بریف کیس کی طرف دیکھا آخر آہستہ آہستہ چلتا ہوا بریف کیس تک پہنچا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ بریف کیس کھلتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، بریف کیس میں کپڑوں کے اوپر سو سو کی گڈیاں پڑی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ نوٹوں کو گھورتا رہا۔ اچانک اس کے شیطانی ذہن میں ایک منصوبہ آگیا۔ اور وہ بریف کیس بند کرتے ہوئے اجنبی کے کمرے کی طرف احتیاط سے بڑھنے لگا۔ اجنبی کی چارپائی کے قریب کھڑا چند لمحے وہ سوچتا رہا اور پھر اس کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ گئے۔

نوجوان نے مزاحمت کی لیکن مچھیرے رامو نے اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا دولت کے لالچ نے اسے اندھا کر دیا تھا لاش کو جوں کا توں چھوڑ کر رامو پھر بریف کیس کی طرف بڑھ گیا جو کہ اب اس کا اپنا تھا۔ صبح ہی صبح جب دروازے پر دستک ہوئی تو رامو ڈرتے ڈرتے اٹھا جب اس نے دروازہ کھولا تو بستی کا چوہدری کھڑا تھا۔ مبارک ہو بھئی رامو تجھے تیرا بیٹا مل گیا وہ رات کو پہلے میرے پاس ہی آیا تھا کہہ رہا تھا کہ ماں باپ کی دعاؤں سے کشتی کے حادثے میں وہ بہتا ہوا شہر پہنچ گیا تھا۔

یہ سنتے ہی لالچی مچھیرا رامو کا دماغ پھٹنے لگا اور وہیں دروازہ پر بیٹھتا چلا گیا۔

سوجھ بوجھ

جاوید عبدالکریم ...... کراچی

(۱)

پہلے پانی اسے پلاؤ
پھر مکوں سے شامت لاؤ
تن پر جب سوجن آجائے
پھر وہ اور طمانچے کھائے

(۲)

ایک نام کے دو کہلائیں
ایک کو چھوڑیں ایک کو کھائیں

(۳)

تن کا ہلکا سر کا بھاری
چوٹ لگاتا ہے وہ کاری

جوابات۔

(۱)۔ آٹا گوندھ کر روٹی پکانا، (۲)۔ انار (ان۔ اناج، نار۔ آگ) (۳)۔ ہتھوڑا،

روشن مثال

The Pick of The month

ان ساتھیوں کا تعارف

جنھوں نے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو

طلال احمر
۹ سال، چہارم۔
مطالعہ، معلومات عامہ۔
چیف آف ایئر اسٹاف تحریری مقابلہ
میں گولڈ میڈل۔
مکان نمبر ۲۲۲/۵-الیف ۹-آر ایف
پی اے سی، کامرہ، اٹک۔

محمد کامران
۱۲ سال، دسویں،
کرکٹ کھیلنا اور کتابیں پڑھنا۔
ہشتم میں پہلی پوزیشن، ریاضی۔
۸/۱۲، ای این
ملیر توسیعی کالونی
کراچی ۳۷۔

محمد معصوم سندیلہ
۱۳ سال، ہفتم۔
مطالعہ، انگلش۔
جماعت ششم میں اوّل۔
پوسٹ آفس احمد پور سندوایہ
پیر گوٹھ۔ ضلع خیر پور۔
(سندھ)

ریاض محمد
۱۶ سال، گیارہویں۔
کتابیں پڑھنا، حساب۔
میٹرک میں اے۔ ون گریڈ۔
مکان ۴۰/۲۷۳
قلندر آباد کالونی
کوٹری۔

عبدالرافع شیخ
۱۵ سال، دہم۔
مطالعہ، انگلش۔
نویں میں اے۔ ون گریڈ۔
مدینہ رائس مل شہداد کوٹ
ضلع لاڑکانہ
(سندھ)

پرویز اختر
۱۳ سال، ہشتم۔
مطالعہ، ریاضی، اُردو۔
چوتھی سے ساتویں جماعت تک
اوّل یا دوئم۔
اورنگی ٹاؤن
کراچی۔

ندیم الرحمٰن
۹ سال، چہارم۔
دینی کتب کا مطالعہ۔
اُردو، ریاضی۔
پہلی سے تیسری جماعت تک
اوّل پوزیشن۔
کراچی۔

سعد احمد شمسی
۱۵ سال، دہم۔
کمپیوٹر پروگرامنگ، کرکٹ، ہاکی۔
حساب۔
نویں جماعت میں ۷۱ فیصد نمبر۔
اے۔ ۱۹ سیکٹر ۱۴/بی
شادمان ٹاؤن، نارتھ کراچی۔

زاہد خان
۱۱ سال، ہفتم۔
دینی کتب کا مطالعہ۔
اسلامیات۔
کل پاکستان مقابلہ نعت خوانی
میں دوئم۔
کورنگی، کراچی۔

زوبیہ ندیم
۱۴ سال، نہم۔
مصوری کرنا، ٹکٹیں جمع کرنا۔
مطالعہ کرنا۔
حساب۔
والی بال سیکنڈ، ریس تھرڈ۔
ضلع جہلم۔

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جا بجا کوپن چھاپنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____ کلاس _____ عمر _____

ارسال کردہ کل رقم _____ بذریعہ _____ دستخط _____

پتا _____

_____

روشن مثال میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____ جماعت _____

مشاغل _____ پسندیدہ مضمون _____

کوئی اہم کامیابی _____

پتہ _____

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر مُوذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سُستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط اردوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطرف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچّوں کی طرح... آئیے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

کیا آپ نے بھی کوئی روشن مثال قائم کی ہے؟

اس تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک سکیں گے جنہوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً۔ امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام،. کوئی اور کارنامہ ....

○ ...... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہوسکے گا۔

○ ...... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہوسکے گی۔

یاد رہے ! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو (BEST OF MONTH) کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تاکہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جاسکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء وطالبات اس میں شریک ہوسکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے، جو صفحہ نمبر ۱۳۵ پر موجود ہے۔

امی ابو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ہما سلیم

ایسا نہیں ہے کہ جن والدین کی اولادیں بے راہ رو ہو جاتی ہیں وہ اپنی اولاد کو اچھا نہیں بنانا چاہتے تھے..... اور ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کی بہتر تربیت کے لئے کچھ جتن نہ کئے ہوں۔

نہ ہی کوئی ایسی بات ہے کہ جاہل والدین کی اولادیں بگڑ جاتی ہیں اور پڑھے لکھے والدین کے سبھی بچے نیک اور فرمانبردار نکلتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام والدین ہی اپنی اولاد کا بھلا چاہتے ہیں، ان کی زندگی کے لئے خیر کے پہلو تلاش کرتے ہیں، ان کے مستقبل کو تابناک اور روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ سب والدین صرف ایسا چاہتے ہیں اپنی اس آرزو میں حقیقت کا رنگ بھرنے اور اپنے خواب کی تعبیریں پانے کے لئے وہ ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے جو اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہیں۔ کچھ والدین اپنے تئیں جتن بھی کرتے ہیں مگر ان کی سمت واضح نہیں ہوتی اور ذہن یکسو نہیں ہوتا۔ بے ترتیب کوششیں اور غیر مربوط کام، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہوتے ہیں۔

بچے کی بہتر تربیت اور اس کی صلاحیتوں کی نشو نما کے لئے یہ صفحہ وقتاً فوقتاً آپ کو کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا ہے مگر ہمارے بتانے اور آپ کے کرنے میں بھی ایک فاصلہ حائل ہے۔ اس فاصلے کو کم کر دیجئے.....

آج سے طے کر لیجئے کہ آپ نے اپنے ہر روز کے وقت میں سے کچھ وقت اپنے بچوں کو دینا ہے..... کبھی انہیں پڑھانے کے لئے، کبھی ان کی سیر و تفریح کے لئے، کبھی ان کے ساتھ گھل مل جانے اور کھیلنے کے لئے تو کبھی انہیں سمجھنے اور سمجھانے کے لئے۔

ہر روز تھوڑا سا وقت عبادت کی طرح اپنے اوپر لازم کر لیجئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ کامیابی کی سمت آپ کا پہلا قدم ہو گا۔

سب دوستوں کے لئے
ایک دوستانہ مشورہ
پیارے دوستو!
آپ کی طرح مجھے بھی سوئیٹس، ٹافیز اور ببل بے حد پسند ہیں لیکن میں خریدتے وقت بہت احتیاط
سے کام لیتی ہوں اور صرف مے فیئر خریدتی ہوں۔
کیونکہ یہ بہترین اجزا سے صحّت کے اصولوں پر تیار ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ مزیدار ہیں۔
—— آپ سب دوستوں کے لئے 'میرا دوستانہ مشورہ' ——
ہمیشہ مے فیئر کی سوئٹیں اور ٹافیز کھائیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔
■ مے فیئر سوئیٹس اور ٹافیز ■ مے فیئر ببل ■ مے فیئر مِلکا چیو
■ مے فیئر فروٹا چیو (اورنج اور اسٹرابیری)
Fruta Chew
Fruta Chew
Milka Chew
mayfair
-the sweet favourites
Bubble
Bubble

REGD. NO. M–266 FEBRUARY '1991

MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI